# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| 3 | صائمہ اسما | ابتدا تیرے نام سے | اداریہ |
| 4 | افشاں نوید | روزہ اور تقویٰ کا حصول | انوار ربانی |
| 7 | سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ | رمضان میں قیام لیل | قول نبیؐ |
| 12 | میر بابر مشتاق | غزوہ بدر | گوشۂ سیرت |
| 15 | مرتبہ: فرزانہ چیمہ | قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے | خاص مضمون |
| 24 | ام عبد منیب | دعا | نوائے شوق |
| 24 | نجمہ یاسمین یوسف | قطعات | |
| 25 | شمیم فاطمہ | غزل | |
| 26 | قانتہ رابعہ | مثالِ آئینہ دار | حقیقت و افسانہ |
| 35 | ربیعہ ندرت | شاہ جی | |
| 39 | تسنیم کوثر | سرِ راہ | |
| 43 | زینب طارق | بیداری | |
| 47 | ممتاز مفتی | ایک تھا بادشاہ | انتخاب |
| 53 | آسیہ راشد | مریم بنت عمران | نمایاں خواتین کا تذکرہ |
| 59 | بشریٰ تسنیم | گنبد خضریٰ کے سامنے | سفرِ سعادت |
| 65 | فرزانہ چیمہ | چلتے چلتے | ہلکا پھلکا |
| 70 | شمیم فاطمہ | کتنی گرد پڑتی ہے! | |
| 74 | فرزانہ چیمہ | اے صبح عید گھر کو سجاؤں تو کس طرح! | خفتگانِ خاک |
| 77 | میر بابر مشتاق/صائم اسما | اسرائیل آغاز سے انجام تک | تبصرہ کتب |
| 79 | حفصہ افضال | پتھروں کی بستی میں | نہاں خانۂ دل |
| 81 | اسما ممتاز | یہ گرمیوں کے روزے | غذا و صحت |
| 83 | آسیہ راشد | میٹھی عید کی میٹھی مصروفیتیں | گھرداری |
| 85 | | فرزانہ چیمہ، ثمرہ، خورشید بیگم | محشرِ خیال |
| 89 | | مہوش عاطف، شفقت ہما، سارہ نور، روبینہ عاطف | بتول میگزین |

# ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! رحمتوں اور برکتوں والے مہینے کا فیضِ عام جاری ہے۔ ہمارے عزیز وطن کا یوم پیدائش بھی شمسی وقمری دونوں اعتبار سے اسی ماہ آرہا ہے یعنی 27 رمضان المبارک اور 14 اگست۔ تاریخ کے اس سفر میں چشمِ عالم ہماری خستگی کے ساتھ ہماری بلند ہمتی کی بھی گواہ ہے۔ ہماری بدنصیبی کے ساتھ ہماری حب الوطنی کی بھی شاہد ہے۔ ہماری بے بسی کے ساتھ ہمارے اجتماعی شعور کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتی۔ ہماری تباہی و بربادی کے ساتھ ہمارے جذبۂ تعمیر کو بھی فراموش نہیں کرسکتی۔ پاکستانی قوم جس کا ایثار وقربانی مثالی ہے، جس کے پاس صبر وبرداشت کا ملکہ وافر ہے، جس کے پاس قربان کرنے کے لئے جانیں اور لٹانے کچھیا بے حد وحساب مال ہے، جو شہیدوں اور غازیوں کی قوم ہے، جان ہتھیلی پر رکھ کر فلاحی کام کرنے والوں کی قوم ہے، انتھک امدادی کارکنوں کی قوم ہے، کھلے دل سے صدقہ، زکوٰۃ اور خیرات دینے والوں کی قوم ہے، آسمانی آفات اور زمینی حوادث کے مقابل پہاڑ کی طرح ڈٹ جانے اور صبر کرنے والوں کی قوم ہے...... مگر جو صرف ایک دیانتدار، خوف خدا رکھنے والی اہل قیادت کو ترس رہی ہے۔

مصری عوام مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے بالآخر امریکی گماشتہ اور آمر حکومت سے نجات حاصل کی اور دنیا کو دکھا دیا کہ عوام اگر پرعزم اور متحد ہوں تو امریکہ اور اس کے حواریوں کے عزائم کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔ ہیلری کلنٹن کا ''شاندار'' استقبال بھی مصری عوام کی حقیقی آزادی کی نوید سنا رہا ہے۔ ساتھ ہی ہیلری کو اہل مصر کا پیغام کہ ''مصر پاکستان نہیں ہے'' ہمارے عوام کے ملّی جذبات کو بھی مہمیز دے رہا ہے۔ انتخابات کا وقت قریب تر آرہا ہے۔ اگر پاکستانی عوام بھی یہ ٹھان لیں کہ آزمائے ہوئے مہروں، بددیانتی سے داغدار دامنوں اور ملکی دولت لوٹ کر جائیدادیں بنانے والے نااہل ٹولے کو ہر صورت مسترد کریں تو عین ممکن ہے کہ ہم بھی مصری عوام کے ہم قسمت ہوجائیں۔ وہ نااہل ٹولہ جس نے باہمی بھائی چارے سے مختلف چہروں میں بٹ کر اپنی اپنی باری پر کھیلنے کی ملی بھگت کر رکھی ہے اور نتیجہ یہ کہ وسائل سے بھرے ہوئے اس امیر ملک کو ایک دن کے ایندھن تک پہنچا دیا ہے۔ اپنی قسمت بدلنا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اللہ بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ابھی تو حال یہ ہے کہ رسمی معافی کے زبانی الفاظ پر نیٹو کی راہداری کھول دی گئی ہے۔ اور معافی بھی ''ہمیں جانوں کے ضیاع پر افسوس ہے'' کی صورت میں جس سے کسی طرح بھی اپنے قبیح جرم کا اعتراف اور اس پر شرمندگی ظاہر نہیں ہوتی۔ عوام کی طرف سے اس فیصلے پر وسیع اور ملک گیر احتجاج اور اظہار ناراضگی سامنے آیا۔ یہ فیصلہ یقیناً رائے عامہ اور ملکی مفاد دونوں کے خلاف ہے اور محض اوپر کے چند گنے چنے لوگوں کے مفادات کے تحفظ پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔

امت کے جرمِ ضعیفی کی سزا ہر وقت کسی نہ کسی خطے میں مسلمانوں کی قسمت بنی رہتی ہے۔ آج برما کے روہنگیا مسلمانوں کا قتلِ عام جاری ہے۔ ماضی قریب کی تاریخ میں یہ ان کا تیسرا قتلِ عام ہے۔ ان کی اپنی زمین ان پر تنگ کردی گئی ہے۔ وہ موت یا ہجرت دونوں میں سے ایک پر مجبور کردیئے گئے، مگر ابھی تک ہجرت کے لئے بھی ان پر اللہ کی زمین وسیع نہیں ہوئی۔ بنگلہ دیش نے ان کو واپس دھکیل دیا۔ کوئی اور مدد کے لئے تیار نہیں۔ یہ دس لاکھ بے بس ومجبور مسلمان مرد عورتیں اور بچے وہ ہیں جو قرآن کی زبان میں کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔ قرآن کی رو سے ان کی مدد ہم پر فرض ہے۔ انسانی حقوق کے نام نہاد عالمی چیمپئن تو مسلمانوں کے حقوق کو انسانی حقوق میں شامل کرنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اور امت مسلمہ کا کوئی فورم ایسا نہیں جو ان بے بس مسلمانوں کی دادرسی کرسکے۔ برما سے جغرافیائی قربت کے ناطے پاکستان کا فرض بنتا ہے کہ حکومتی پیمانے پر ان مسلمانوں کی امداد کرے۔ علاقائی تعاون کی تنظیم آسیان میں تین مسلمان ممالک بھی شامل ہیں یعنی ملائشیا، انڈونیشیا اور برونائی دارالسلام جن سے پاکستان کے برادرانہ اور دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ پاکستانی حکومت ان ممالک سے اپیل کرسکتی ہے کہ وہ اس فورم پر ممبر ممالک پر دباؤ کے ذریعے برما کی حکومت کو اس ظلم سے روکے۔ نیٹ پر اس قتل عام کی ویڈیوز اور تصاویر جن کو دیکھنا اگرچہ پتھر کے جگر کا متقاضی ہے، مگر وہ پھر بھی پتھر دلوں کو موم نہیں کرسکیں۔ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے، برما کے مسلمانوں کو اس ظلم سے بحفاظت نکالے اور ہمیں اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے آمین۔

کراچی میں ٹارگٹ کلنگ اور ہنگاموں کا بدستور جاری رہنا بے حد تکلیف دہ ہے۔ دوسری طرف سحر وافطار سمیت دن بھر طویل لوڈشیڈنگ کے خلاف پنجاب کے اور دیگر کئی شہروں میں پرتشدد احتجاج، ہنگاموں، توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کا سلسلہ جاری رہا، ایسے بدنصیب، بے توفیق اور سیاہ رو حکمران ہم پر مسلط ہیں جو اتنے طویل اور گرم روزوں میں عوام کو سہولت دینے کی بجائے ان کے روزے کو مزید پرمشقت بنانے کے کام پر مامور ہیں اور دن رات عوام کی آہیں اور بددعائیں اکٹھی کررہے ہیں۔ ایسے ہی حکمرانوں سے نجات کے لئے یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ **اللهم لا تسلط علینا من لا یرحمنا** ۔اے اللہ ہم پر ایسے لوگ مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کریں۔

ملکی حالات ہمیشہ سے زیادہ اجتماعی توبہ واستغفار کے متقاضی ہیں۔ آخری عشرے کی طاق راتوں میں وطن عزیز کی خوشحالی اور عافیت کے لئے دعائیں کرنا نہ بھولیے کیونکہ اس وطن کا قیام انہی مبارک گھڑیوں کا مرہون منت ہے۔

دعا گو

صائمہ اسماء

# روزہ اور تقویٰ کا حصول

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی'' (البقرہ:183)

گیارہ مہینے خوب کھایا اور کھاتے چلے گئے۔ کیونکہ کھانا اب ہمارا قومی شعار بن گیا ہے اور اب کھانے کے لئے گھر کا دسترخوان ہی نہیں سجتا سڑکوں پر بھی کھایا جاتا ہے، چوک، چوراہوں پر کھایا جاتا ہے، ٹھیلوں پر کھڑے ہو کر کھایا پیا جاتا ہے، جیسے دسترخوان خوشی پر سجتے ہیں کم و بیش ویسے ہی دسترخوان غمی پر سجتے ہیں۔ اس متمول خاندان کے نوجوان بیٹے نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔ سوئم کی تقریب تھی ہمارے بھی قریبی مراسم تھے۔ کھانے کا اتنا عمدہ اہتمام! خواتین آپس میں گفتگو کرتی رہیں کہ بیگ صاحب کی کیٹرنگ ہمیشہ اتنی عمدہ ہوتی ہے۔ صاحب ذوق ہیں سو بیٹے کے انتقال پر بھی اپنی خاندانی جاہ وحشمت کی لاج رکھی۔ سوٹھنڈے گرم مشروبات اور لذّت کام ودھن کے بیچ کبھی کبھی مغفرت کی دعائیں بھی جاری رہیں!

ذکر ہے کھانے کا اور یہ کھانے کی عادت ہمیں ایسی بھا گئی ہے کہ کھاتے ہی چلے گئے۔ اغیار کے جوتے کھائے، قومی حمیت کو بیچ کھایا، ملکی خزانے کو لوٹ کھایا، قرضے کھا کر بینکوں کو دیوالیہ کر دیا، ڈالروں کے عوض پاکستانیوں کو بیچ کر کھا گئے، قدرتی آفات کے موقع پر ملنے والی کثیر غیر ملکی امداد کھا گئے۔ ریاستی ادارے کوڑیوں کے مول فروخت کر کے کھا گئے۔ حلال کھایا حرام کیا لیکن......شکم سیری نہ ہو سکی!!

لیجئے اس عادتِ بسیار خوری پر ضرب لگانے آیا ہے ماہ رمضان ماہِ تزکیہ۔ لیکن اس بھوک اور پیاس کے مہینے میں ہم خواہش شکم سیری سے اتنے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ایک ماہ کا بجٹ بڑھ کر دو ماہ کے بجٹ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بھوک اور پیاس کی اس مشقت سے گزرنے کا واحد مقصد تو تقویٰ کا حصول تھا، تزکیہ تھا۔ لیکن عام مشاہدہ ہے کہ جتنا بجٹ رمضان میں اشیائے خورونوش پر خرچ ہوتا ہے عام دنوں میں نہیں ہوتا اور لذّت کام ودھن کی خواہش سب خواہشوں پر غالب آ جاتی ہے۔ فرج اور ڈیپ فریزر انواع واقسام کی لذیذ چیزوں کے اسٹاک سے بوجھل ہو جاتے ہیں اور کچھ یہی بوجھل پن ہمارے وجود کا حصہ بھی بن جاتا ہے۔ ماہ رجب سے خواتین کی گفتگو کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ ''اتنی مہنگائی ہے رمضان کے بجٹ کا کیا ہوگا؟'' سوال یہ ہے کہ جب دو کے بجائے ایک وقت کھانا ٹھہرا تو بجٹ تو نصف ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن حالتِ بھوک (روزہ) میں ''بھوک'' کچھ ایسے ہمارے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے کہ وہ ضرورت سے بڑھ کر ''ہوس'' بن جاتی ہے۔

اس پر مستزاد میڈیا کے سارے چینل پیٹ بھرنے، دسترخوان سجانے اور نت نئی سحر وافطار کی لذتوں کی ترغیب

دیتے نظر آتے ہیں۔ میں نے خالہ جان سے پوچھا ''ریٹائرمنٹ کے بعد پہلا رمضان خالو جان کیسے گزار رہے ہیں؟''

خالہ جان بولیں ''سارا دن مصالحہ چینل دیکھتے رہتے ہیں۔ کھانا پکانے کے پروگراموں سے رغبت نہ جانے کیوں اتنی بڑھ گئی......اب تو ظہر کے بعد سے افطار کے لوازمات میں لگ جاتے ہیں۔ بہت ہاتھ بٹانے لگے ہیں کچن میں......دسترخوان کی رونق بہت بڑھ گئی اس رمضان میں!''

ہمارا دین ہمیں شکم سیری سے روکتا ہے اور ماہ رمضان میں ہمیں بھوکا رکھ کر ہمیں روحانی بالیدگی کی مشق کرانے آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی ''بھوک'' ہمیں رب کی معرفت عطا کرنے کے بجائے اشتعال انگیز بنا دیتی ہے۔ پچھلے برس ماہ رمضان میں میں نے تجزیہ کیا کہ ہمارے ملک میں جتنے اشتعال انگیز مناظر ماہ رمضان میں دیکھنے میں آئے باقی گیارہ ماہ میں نہیں آئے۔ چاہے وہ گارڈز اور چوکیدار کے ساتھ تلخ کلامی کے واقعات ہوں یا مرد حضرات کے پانی اور صفائی کے مسائل پر آپس میں جھگڑے۔ ماسی کام کرتے کرتے ایک دن بولی کہ ''باجیوں کو رمضان میں غصہ بہت آتا ہے۔ ہمارا رمضان بہت مشکل سے گزرتا ہے۔'' وہ بھوک ہماری تربیت کے بجائے ہمیں منفی جذبوں کا خوگر کیونکر بنا دیتی ہے؟ اس لیے کہ ہم نے دانستہ اس کیفیت کا رخ مثبت سوچ کی طرف نہیں موڑا۔ یہاں بھی شیطان کامیاب اور ہم ناکام۔ تزکیہ پھر کس چیز کا کیا؟ تقویٰ پھر کہاں نظر آیا جب رویے ہی نہ بدلے؟ رمضان تو مواخات کا مہینہ ہے، رحم دلی کا، نوکر چاکروں کا بوجھ کم کرنے کا مہینہ ہے۔ جبکہ ہم ماہ رمضان میں اضافی بوجھ ڈالتے ہیں گھر کے نوکروں پر۔ جب میں نے ماسی سے اصرار کیا کہ وہ آخری عشرے کے روزے رکھا کرے تو وہ انتہائی مسکینی سے بولی ''باجی آپ کو معلوم نہیں سال کی بڑی صفائی تو باجیاں آخری عشرے میں کراتی ہیں ہم تو دن کو گھر ہی نہیں جا پاتے، شام اور کبھی کبھی رات ہو جاتی ہے۔ جھاڑ پونچھ، دھلائیوں میں......اکثر باجیاں تو آخری عشرے میں گھر کو رنگ و روغن کراتی ہیں۔ پھر آپ جانیں کتنا کام ہوتا ہے!''

شعبان کے آخر سے تمام اشیائے خورد و نوش اور مشروبات کے اشتہارات ''رمضان کی خصوصی آفر'' کے ساتھ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص کولا مشروبات جو ویسے بھی مضر ہیں اور رمضان میں تو بالخصوص۔ رمضان کی خصوصی نشریات، خصوصی اشتہارات، رمضان کو کمرشلائز تو کافی عرصے سے کر دیا گیا تھا، جب بڑے بڑے ہوٹلوں کے سحر و افطار کے خصوصی پیکیجز نظروں سے گزرتے۔ اب تو رمضان کو گلیمرائز کر دیا گیا ہے، وہ سحر و افطار کی نشریات ہوں یا آخری عشرے کی طاق راتیں۔ ایسے پرکشش پروگرامات کہ بچے اور بڑے سب سحر و افطار کے اوقات میں ٹکٹکی باندھے ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور خیال ہی نہیں آتا کہ یہ بابرکت گھڑیاں تو رجوع الی اللہ کی گھڑیاں تھیں۔ شب قدر کے موقع پر آس پڑوس سے ٹی وی کی آوازیں سن کر میں سوچنے لگی کہ رات رات بھر کی نشریات بیقیناں کی دعائیں، سب کچھ نے اتنا محو رکھا کہ صبح ہوتے خیال آیا کہ ''ارے مجھے بھی تو کچھ مانگنا تھا......اپنے گناہوں پر استغفار تو مجھے خود ہی کرنا تھی۔ میرے حصے کی دعا کوئی دوسرا بھی مانگ سکتا ہے بھلا......؟''

اب ٹی وی چینلز سحر و افطار کے ساتھ طاق راتوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں، جو خواتین وہاں پہنچ جاتی ہیں فبہا، باقی گھروں پر لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ان نورانی ساعتوں سے

جن کے ''نور'' کو کیمروں کی لائٹ چکا چوند کر دیتی ہے۔

مجھ سے کسی نے کہا کہ رمضان میں ایک سنت کو ضرور پریکٹس کرنے کی کوشش کرنا کہ اللہ کے نبیؐ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا تھا اور بھرے ہوئے پیٹ کو آپؐ نے کبھی پسند نہیں کیا۔ تب میں نے سوچا کہ عام دنوں میں شاید اس سنت پر عمل کرنا کسی درجہ ممکن بھی ہو جب دسترخوان پر دال چاول یا سالن روٹی ہوتا ہے لیکن رمضان میں جب دسترخوان پر دہی بڑے، چھولے، سموسے، چائنیز رول، کٹلٹس، چکن پکوڑے، فروٹ چاٹ، فرائی پالک اور بینگن کے پکوڑے، شربت اور شیک بیک وقت موجود ہوں تو اس سنت پر عمل کس طرح ممکن ہے کہ پیٹ کے دو حصے بھرے اور ایک خالی رہے۔ پھر تو دسترخوان سے اٹھ کر نماز پڑھنا دوبھر لگتا ہے۔ رکوع، سجدے بھرا ہوا پیٹ بوجھل بنا دیتا ہے۔ مغرب کے بعد چائے کا دور، تراویح کے بعد کھانے کا دور، پھر استراحت اور پھر سحر میں سجا ہوا دسترخوان کہ خاتونِ خانہ فکر مند ہیں کہ اہل خانہ کسی کمزوری کا شکار نہ ہو جائیں۔ گھی کے پراٹھوں، کباب اور قیمے کے ساتھ کھجلا پھینی بھی ہے، کھجور کا شیک اور لسّی بھی ہے۔ پھر وہی حلق تک بھرا ہوا پیٹ، لحہ لحہ آتی ڈکاریں اور فجر کی تلاوت!!! (یہ مناظر رمضان میں ہم میں سے اکثر گھرانوں کے مناظر ہیں)

یہی وجہ ہے کہ رمضان اور بہت کچھ دے جاتا ہے لیکن اس تزکیہ نفس سے ہم محروم رہ جاتے ہیں (خدانخواستہ)۔ امام غزالیؒ نے فرمایا تھا کہ'' بھرا ہوا پیٹ بندے اور رب کے درمیان حجاب ہوتا ہے۔'' اور ماہ رمضان میں یہ حجاب ہم دبیز تر کر دیتے ہیں ہماری بسیار خوری اور شکم سیری میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم رب کی معرفت سے دور رہ جاتے ہیں۔ ہمارا نفس ویسا ہی دھندلا، میلا، کچیلا رہ جاتا ہے کیونکہ ہمارا بھرا ہوا پیٹ (یا پیٹ کو بھر لینے کی خواہش) ہمارے اور رب کی معرفت کے درمیان حجاب بنی رہتی ہے۔ ہم کچھ ظاہری رسوم کو کچھ اضافی تلاوت یا نوافل کو تقویٰ سے تعبیر کر لیتے ہیں، اور تقویٰ وہ اسپرٹ ہمارے اندر پیدا نہیں کرتا کہ باقی گیارہ ماہ میں ہمیں روک سکے نافرمانی کے راستوں سے۔ ہم جائز لذتوں سے دور رہ کر ناجائز سے بچنے کی قوت پا سکیں۔ ہم نے نفس کو کس خواہش سے باز رکھا؟ کب ہم نفس کے گھوڑے پر سوار ہوئے، ہم گھوڑے کی لگامیں تھامے رہے وہ ہمیں سرپٹ دوڑاتا رہا شکر کی جگہ ناشکری کے صحرا میں، عجز کی جگہ تکبر کے سراب میں، اعتدال کی بجائے اسراف کی راہوں میں، سادگی کے بجائے تصنع کے دلدل میں، اخلاص ومحبت کی جگہ بغض، عداوت اور کینہ کے راستوں پر۔

نہ معلوم پھر یہ رمضان نصیب ہو کہ نہ ہو۔ آیئے عہد کرتے ہیں کہ رمضان ایسے گزاریں گے کہ عید پر ہمارا لباس تقویٰ تیار ہو اور جب عید پر گھر میں ہم نئی چادریں، نئے تکیے، نئے پھول سجائیں تو اس بوسیدہ اور تار تار لباس تقویٰ کی جگہ یہ نئی پوشاک نیا لباس تقویٰ ہمارا منتظر ہو اور آسمان پر ہمارے لئے صدائیں ہوں کہ ''مقبول ہوئی آ کچی مزدوری...... پورا کر دیا آپ نے اپنے حصے کا کام!''

☆☆☆

# رمضان میں قیام لیل

تراویح کے بارے میں معلومات کا خلاصہ

تراویح کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) نبی ﷺ دوسرے زمانوں کی بہ نسبت رمضان کے زمانے میں قیامِ لیل کے لئے زیادہ ترغیب دیا کرتے تھے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز آپ کو بہت محبوب تھی۔

(۲) صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں تین رات نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی اور پھر یہ فرما کر اسے چھوڑ دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تراویح میں جماعت مسنون ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تراویح فرض کے درجہ میں نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ چاہتے تھے کہ لوگ ایک پسندیدہ سنت کے طور پر تراویح پڑھتے رہیں مگر بالکل فرض کی طرح لازم نہ سمجھ لیں۔

(۳) تمام روایات کو جمع کرنے سے جو چیز حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے خود جماعت کے ساتھ رمضان میں جو نماز پڑھائی وہ اول وقت تھی نہ کہ آخر وقت میں۔ اور وہ آٹھ رکعتیں تھیں نہ کہ بیس۔ (اگرچہ ایک روایت بیس کی بھی ہے مگر وہ آٹھ والی روایت کیا بہ نسبت ضعیف ہے) اور یہ کہ لوگ حضورؐ کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز کے بعد واپس جا کر اپنے طور پر مزید کچھ رکعتیں بھی پڑھتے تھے۔ وہ مزید رکعتیں کتنی ہوتی تھیں؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں ملتی۔ لیکن بعد میں جو حضرت عمرؓ نے ۲۰ رکعتیں پڑھنے کا طریقہ رائج کی اور تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ زائد رکعتیں ۱۲ ہوتی تھیں۔

(۴) حضورؐ کے زمانہ سے لے کر حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک باقاعدہ ایک جماعت میں سب لوگوں کے تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج نہ تھا، بلکہ لوگ یا تو اپنے اپنے گھروں میں پڑھتے تھے یا مسجد میں متفرق طور پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ اسی تفرق کو دور کر کے سب لوگوں کو ایک جماعت کی شکل میں نماز پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس یہ حجت موجود تھی کہ حضورؐ نے اس سلسلہ کو یہ فرما کر بند کیا تا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے۔ اور حضورؐ کے گزر جانے کے بعد اس امر کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا کہ کسی کے فعل سے یہ چیز فرض قرار پا سکے گی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ایک سنت اور مندوب چیز کی حیثیت سے اس کو جاری کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے تفقہ کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے کہ انہوں نے شارع کے منشا کو ٹھیک ٹھیک اور امت میں ایک صحیح طریقے کو رائج فرما دیا۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کا اس پر اعتراض نہ کرنا، بلکہ بسر و چشم اسے قبول کر لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ شارع کے اس منشا کو بھی ٹھیک ٹھیک پورا کیا گیا کہ ''اسے

فرض کے درجہ میں نہ کر دیا جائے۔'' چنانچہ کم از کم ایک بار تو ان کا خود تراویح میں شریک نہ ہونا ثابت ہے جب کہ وہ عبدالرحمٰنؓ بن عبد کے ساتھ نکلے اور مسجد میں لوگوں کو تراویح پڑھتے دیکھ کر اظہار تحسین فرمایا۔

(۵) حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو باتفاقِ صحابہ بیس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں اور اسی کی پیروی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی ہوئی۔ تینوں خلفاء کا اس پر اتفاق اور پھر صحابہؓ کا اس پر اختلاف نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد سے لوگ تراویح کی بیس ہی رکعتوں کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تینوں بیس ہی رکعت کے قائل ہیں، اور ایک قوم امام مالکؒ کا بھی اسی کے حق میں ہے۔ داؤد ظاہریؒ نے بھی اسی کو سنتِ ثانیہ تسلیم کیا ہے۔

(۶) حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت ابان بن عثمان نے ۲۰ کے بجائے ۳۶ رکعتیں پڑھنے کا جو طریقہ شروع کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کی تحقیق خلفاء راشدین کی تحقیق کے خلاف تھی، بلکہ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مکہ سے باہر کے لوگ ثواب میں اہل مکہ کے برابر ہو جائیں۔ اہل مکہ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ تراویح کی ہر چار رکعتوں کے بعد کعبے کا طواف کرتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے ہر طواف کے بدلے چار رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ یہ طریقہ چونکہ اہل مدینہ میں رائج تھا اور امام مالک اہل مدینہ کے عمل کو سند سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے بعد میں بیس کے بجائے ۳۶ کے حق میں فتویٰ دے دیا۔

(۷) علماء جس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ جس بستی یا محلے میں سرے سے نماز تراویح با جماعت ادا ہی نہ کی جائے اس کے سب لوگ گنہ گار ہیں، وہ یہ ہے کہ تراویح ایک سنت الاسلام ہے جو عہدِ خلافتِ راشدہ سے تمام امت میں جاری ہے۔ ایک ایسے اسلامی طریقہ کو چھوڑ دینا اور بستی کے سارے ہی مسلمانوں کا مل کر چھوڑ دینا، دین سے ایک عام بے پروائی کی علامت ہے جس کو گوارا کر لیا جائے تو رفتہ رفتہ وہاں سے تمام اسلامی طریقوں کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

(۸) اس امر میں اختلاف ہے کہ تراویح کے لیے افضل وقت کون سا ہے۔ عشاء کا وقت یا تہجد کا؟ دلائل دونوں کے حق میں ہیں، مگر زیادہ تر رجحان آخر وقت ہی کی طرف ہے۔ البتہ اول وقت کی ترجیح کے لئے بات بہت وزنی ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اول وقت ہی کی تراویح پڑھ سکتے ہیں، آخر وقت اختیار کرنے کی صورت میں امت کے سوادِ اعظم کا اس ثواب سے محروم رہ جانا ایک بڑا نقصان ہے اور اگر چند صلحاء وقت کی فضیلت سے مستفید ہونے کی خاطر اول وقت کی جماعت میں شریک نہ ہوں تو اس سے یہ اندیشہ ہے کہ عوام الناس یا تو ان صلحاء سے بدگمان ہوں، یا ان کی عدم شرکت کی وجہ سے خود ہی تراویح چھوڑ بیٹھیں، یا پھر ان صلحاء کو اپنی تہجد خوانی کا ڈھنڈورہ پیٹنے پر مجبور ہونا پڑے۔ ھذا ما عندی والعلم عنداللہ وھو اعلم بالصواب۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عبدالقاری کا بیان ہے کہ رمضان کی ایک رات میں، میں عمر بنؓ خطاب کے ساتھ مسجد کی طرف نکلا۔ دیکھا کہ لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی تن تنہا نماز پڑھ رہا ہے۔ کچھ کسی ایک کی امامت واقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ صورت حال دیکھ کر فرمایا: میرا خیال ہے کہ میں ان سب کو ایک قاری کے ماتحت جمع کر دوں کہ وہ انہیں نماز پڑھائے تو یہ مثالی اور عمدہ بات ہوگی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عزمِ صمیم کے

ساتھ لوگوں کی ابی ابن کعب کی اقتداء پر اکٹھا کر دیا۔ عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ پھر میں نے ایک رات حضرت عمرؓ کے ساتھ نکل کھڑا ہوا تو دیکھا کہ سب لوگ ایک ہی قاری کے پیچھے اکٹھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر فرمایا'' یہ بدعت تو بہت اچھی ہے'' انکا مطلب یہ تھا کہ رات کہ آخری حصّہ میں (نماز تراویح) پڑھنا اول حصے میں پڑھنے سے بہتر اور افضل ہے۔

## لیلتہ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ'' رسولؐ اللہ نے فرمایا: لیلتہ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں کی طاق (اکیس، تئیس، پچیس، ستائیس اور انتیس) راتوں میں تلاش کرو۔''

## قدر سے کیا مراد ہے؟

قدر کے کئی معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ رات بہت ہی احترام کے قابل اور بڑی عظمت والی ہے۔ کیونکہ اس میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ اس کے علاوہ قدر کا لفظ قضاوقدر کے معنوں میں بھی ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ **تنزل الملكة والروح فيها باذن ربهم من كل امر** '' ملائکہ اور جبریلؑ اس رات میں اپنے رب کے حکم سے ہرطرح کے احکام وفرامین لے کر نازل ہوتے ہیں۔'' چنانچہ اس کے معنی تقدیر بنانے کی رات کے بھی ہوسکتے ہیں۔ بعض مفسرین نے قدر کو ضیق اور تنگی کے معنوں میں لیا ہے اور وہ لیلتہ القدر کا مفہوم یہ قرار دیتے ہیں کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے تنگی کی ہے کہ اس کی صحیح تاریخ لوگوں کو بتائی جائے۔ لیکن یہ ایک دور کا مفہوم ہے۔

لیلتہ القدر کے متعلق یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ رمضان کی کون سی رات ہے۔ نبیﷺ نے جو کچھ بتایا وہ بس یہ ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ اس لیے اسے انہی راتوں میں تلاش کرو۔

لیلتہ القدر کا قطعی طور پر تعین نہ کرنے میں یہ حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ آدمی ہر طاق رات میں اس امید پر اللہ کے حضور میں کھڑ ہو کر عبادت کرے کہ شاید یہی لیلتہ القدر ہو۔ لیلتہ القدر اگر اس نے پالی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز کا وہ طالب تھا وہ اسے مل گئی۔ اب اس کے بعد اس نے جو چند مزید راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں تو وہ اس کی نیکی میں اضافے کا باعث بنیں گی۔

امام ترمذی کہتے ہیں نبیﷺ کی اکثر روایات میں ہے کہ اس رات کو تم آخری دس راتوں کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

اور نبیﷺ سے یہ بھی مروی ہے کہ لیلتہ القدر اکیس، تئیس، پچیس، ستائیس اور رمضان کی آخری رات میں ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے ہے کہ میرے نزدیک اقویٰ روایات کی بنیاد پر اکیس تاریخ کی رات ہے۔ امام ترمذی کہتے ہیں ابی بن کعب سے مروی ہے کہ وہ قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ وہ ستائیسویں تاریخ کی رات ہے اور وہ کہا کرتے تھے کہ رسولﷺ نے ہمیں اس کی علامت بھی بتائی تھی ہم نے اسے یاد رکھا ہے۔ ابوقلابہ سے مروی ہے ان کا خیال ہے کہ لیلتہ القدر آخری دس دنوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

## لیلتہ القدر کے بارے میں صحابہ کرام کا خواب

'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبیﷺ کے کئی صحابہؓ کو خواب میں دکھایا گیا کہ لیلتہ القدر رمضان کی آخری سات تاریخوں میں ہے۔ جب یہ بات رسولؐ کی خدمت میں عرض کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں

کہ تم لوگوں کے خواب رمضان کے آخری سات دنوں کے بارے میں متفق ہو گئے ہیں۔ پس اب جو شخص لیلتہ القدر کی تلاش کرے تو وہ رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرے۔''

تشریح: یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو متعدد احادیث ایک دوسرے سے مختلف آئی ہیں ان کے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی حدیث، زمانی اعتبار سے پہلے کی ہو اور کوئی بعد کی۔ کیونکہ راویوں نے احادیث کی روایت کرتے وقت ان کا زمانہ بیان نہیں کیا۔ اس حدیث میں بھی ایسا کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے کہ کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اوپر حضرت عائشہؓ کی روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ لیلتہ القدر کو رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرو۔ یہاں بہت سے صحابہؓ کے ایک خواب کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق وہ رمضان کی آخری سات راتوں میں سے کوئی رات ہے۔ چنانچہ رسول ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ کئی صحابہؓ کو ایک ہی خواب نظر آیا ہے یہ فرمایا کہ اب لیلتہ القدر کو رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرو۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت پہلے کی ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بعد کی ہے (واللہ اعلم بالصواب) ایسی احادیث کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ باہم متضاد ہیں۔ بلکہ درحقیقت ان میں اختلاف ترتیبِ زمانی کی تقدیم و تاخیر کی وجہ سے ہوا اور اس نوع کا اختلاف ان کو متضاد یا غلط قرار دیے جانے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

شب قدر کے متعلق اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب ۴۰ مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں لیکن علمائے امت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے اور ان میں بھی زیادہ لوگوں کی رائے یہ کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے اس دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا حضرت عمرؓ، حضرت حدیفہؓ اور اصحابِ رسول ﷺ میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔ (ابن ابی شیبہ)

حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں سات دن یا پانچ دن یا تین دن یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان راتوں میں لیلتہ القدر کو تلاش کرو۔ (ترمذی۔نسائی)

اس معاملے میں جو روایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی بناء پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی شب قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعین اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ شب قدر کی فضلیت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی رات پر اکتفانہ کریں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت مکہ معظّمہ میں رات ہوتی ہے اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصے میں دن ہوتا ہے، اس لیے ان علاقوں کے لوگ تو کبھی شب قدر کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی ان تاریخوں میں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصہ میں ہو اس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شب قدر ہوسکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے کئی صحابہؓ کو خواب میں دکھایا گیا کہ لیلتہ القدر رمضان کی آخری سات تاریخوں میں ہے۔ جب یہ بات رسول ﷺ کی خدمت

میں عرض کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگوں کے خواب رمضان کے آخری سات دنوں کے بارے میں متفق ہو گئے ہیں۔ پس اب جو شخص لیلۃ القدر کی تلاش کرے تو وہ رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرے۔

## لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرنے ہدایت

''حضرت عبداللہ عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: لیلۃ القدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس طاق راتوں میں، یعنی اکیس یا انتیس کو، تیئیس یا ستائیس کو یا پچیس کو۔''

تشریح: حدیث کے متن میں فی تاسعہ تبقیٰ کے اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آئے ہیں۔ یہ دراصل عربی زبان میں اعداد بیان کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ اگر ان کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو مفہوم خبط ہو جائے گا۔ عربوں میں چونکہ لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے وہ اپنا حساب کتاب عام طور پر انگلیوں سے کیا کرتے تھے اور ان کے ہاں اعداد بیان کرنے کے بعض دوسرے طریقے رائج تھے۔ انہی میں سے ایک خاص طریقہ یہ بھی تھا جس کے مطابق یہاں گنتی کر کے تاریخوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

حدیث کے متن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا زمانہ بھی وہی ہے جو حضرت عائشہؓ کی روایت کا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں آخری عشرے کی طاق راتوں کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے لیکن حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت میں تاریخوں کی صراحت بھی موجود ہے کہ لیلۃ القدر کو آخری عشرے کی ان راتوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس طرح یہ حدیثیں باہم مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں بلکہ دراصل ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔

☆☆☆

میر بابر مشتاق

# غزوہ بدر

حق و باطل میں فرق کرنے والی جنگ جس نے اسلامی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا

تاریخ اسلام میں غزوہ بدر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے خود شرکت کی ہو۔ غزوہ بدر باقاعدہ طور پر مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان پہلی جنگ تھی جس نے اسلامی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔

معرکہ بدر کا باقاعدہ آغاز ۱۷ رمضان المبارک سن ۲ ہجری کو ہوا۔ ایک طرف اللہ وحدہ لاشریک کو ماننے والے اور دوسری طرف بتوں کے پجاری اور غیر اللہ سے مدد مانگنے والے تھے۔ تیرہ سال تک ظلم کی چکی میں پسنے والے آج ظالموں سے ٹکرانے چلے تھے۔

جنگ کا آغاز مشرکین کی طرف سے آنے والے تیر سے ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے غلام اس تیر کے لگنے سے شہید ہوئے۔ اس طرح وہ غزوہ بدر کے پہلے شہید تھے۔

جنگ بدر سے پہلے نبیؐ مہربان اللہ کے حضور دعا میں مشغول تھے۔ ''اے اللہ اگر آج یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو آئندہ تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ اے اللہ تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما۔ اے اللہ ہم تجھ سے تیری مدد کے طلب گار ہیں۔''

آپؐ نے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا ہوا تھا اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی چادر مبارک کندھوں سے نیچے سرک گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ انہوں نے آپ کی چادر درست کی اور کہا اللہ کے رسولؐ بس کریں اللہ تعالیٰ آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

ابتدائی جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے حضرت عبیدہؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ اور مشرکین کی طرف سے سردارانِ قریش عتبہ، شیبہ اور ولید نکلے۔ حضرت حمزہؓ نے ایک ہی وار میں شیبہ کا خاتمہ کر دیا اور حضرت علیؓ نے ولید کو واصل جہنم کیا۔ آپ کی تلوار کا وار اس کے کندھے کو کاٹتے ہوئے گزر گیا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔

حضرت عبیدہؓ اور عتبہ میں مقابلہ کافی دیر ہوتا رہا۔ حضرت عبیدہؓ کو گہرے زخم آئے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر عتبہ کا کام تمام کر دیا۔ اس جنگ کے بعد حضرت عبیدہؓ زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔

عمیر بن حمامؓ، ایک انصاری صحابی نے جب اللہ کے نبی کی زبان سے یہ بشارت سنی ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے جو شخص جم کر دشمن سے لڑے گا اور بہادری دکھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت عطا فرمائے گا۔'' اس وقت آپ کھجوریں کھا رہے تھے۔ فوراً ہاتھ روک لیا، کھجوروں کی طرف دیکھا اور کہا یہ تو زیادہ ہیں ان کو کھانے میں وقت لگے گا، میں جنت میں جانے کے لئے دیر کیوں کروں؟ یہ کہا اور کھجوریں پھینک دیں آگے بڑھے اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے دشمنوں کو قتل کرنے لگے اور آخر کار جام شہادت نوش کر گئے۔

اسلام کا سب سے بڑا دشمن وقت کا فرعون ابوجہل مشرکین کی قیادت کر رہا تھا۔ دو انصاری نوجوان ابوجہل کی تلاش میں تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کہتے ہیں جنگ کے دوران دونوں نوجوان میرے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے اور کہا چچا جان! ابوجہل کہاں ہے؟ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا بھتیجے تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم نے سنا ہے کہ وہ اللہ کے نبیؐ کو تنگ کرتا ہے۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ اسے قتل کریں گے یا خود شہید ہو جائیں گے۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اشارے سے ان کو بتایا کہ جو شخص گھوڑے پر بیٹھا صفوں کو درست کر رہا ہے وہ ابوجہل ہے۔

یہ دونوں نوجوان معاذ اور معوذ دشمن رسولؐ ابوجہل کی طرف لپکے۔ ابوجہل کو بہت سارے لوگ گھیرے میں لیے ہوئے تھے اور وہ کہہ رہے تھے آج ابوالحکم یعنی ابوجہل تک کوئی نہیں پہنچ پائے گا۔ حضرت معاذؓ نے جب یہ سنا وہ تیر کی طرح آگے بڑھے، سیدھے ابوجہل کے پاس جا پہنچے اور جاتے ہی تلوار کا وار اس کی پنڈلی پر کیا۔ عکرمہ بن ابوجہل باپ کو زخمی دیکھ کر آگے بڑھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور حضرت معاذؓ کے کندھے پر تلوار کا وار کیا۔ ان کا بازو کٹ گیا لیکن کٹ جانے کے باوجود کھال کے ساتھ لٹکتا رہا جس کو آپ نے خود پاؤں کے نیچے رکھ کر اتار دیا۔ دوسرے ہاتھ سے آپ نے ابوجہل پر حملہ کیا جس سے شدید زخمی ہو گیا اور گھوڑے سے نیچے آ گرا۔ حضرت معاذؓ نے اس کو مردہ خیال کیا اور جنگ میں مشغول ہو گئے لیکن ابوجہل میں کچھ جان باقی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود اس کے پاس سے گزرے تو اس میں جان پا کر رک گئے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر فرمایا، اے اللہ کے دشمن اللہ نے تجھے رسوا کر دیا۔ پھر انہوں نے اس کا سر کاٹ دیا۔

ادھر دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اللہ کے رسولؐ میں نے ابوجہل کو قتل کیا ہے۔ یہ سنتے ہی دوسرے نے کہا اللہ کے رسولؐ میں نے قتل کیا ہے۔ آپ مسکرائے اور فرمایا تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے۔

عکاشہؓ بن محص بہت بہادر نوجوان تھے لڑتے ہوئے آپ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ آپؓ رسولؐ اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے اللہ کے رسولؐ میری تلوار ٹوٹ گئی ہے۔ آپؐ نے ان کو ایک لکڑی عطا فرمائی اور فرمایا عکاشہ تم اس سے لڑو۔ جونہی عکاشہ نے وہ لکڑی ہاتھ میں لی وہ لمبی اور سخت چمک دار لوہے کی تلوار بن گئی۔ اس جنگ کے بعد بھی یہ تلوار ان کے پاس رہی یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں مرتدوں سے جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں آپؓ شہید ہوئے وہ تلوار اس وقت بھی آپؓ کے پاس تھی۔

بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ اس دن کو یوم فرقان کہا گیا۔ یہ جنگ حق و باطل میں فرق کرنے والی جنگ تھی۔ اس جنگ نے قریش کا غرور خاک میں ملا دیا۔ ان کے ۷۰ بڑے سردار، جری، بہادر مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے۔ مسلمانوں کے ۱۴ افراد شہید ہوئے ان کو میدان بدر میں دفن کیا گیا جب کہ کافروں کی لاشوں کو ایک کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ اس موقع پر آپؐ نے لاشوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''تمہارے پروردگار نے جو کچھ تم سے وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے سچا پایا۔ مجھ سے تو میرے پروردگار نے جو کچھ فرمایا تھا بلاشبہ میں نے اسے سچا پایا۔ پھر ان لاشوں پر مٹی ڈال دی۔''

رسولؐ اللہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں

گرفتار ۔ ے قیدیوں کے بارے میں صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا ان سب کو قتل کر دیا جائے بلکہ ہر ایک ان میں اپنے رشتے دار کو اپنے ہاتھوں قتل کرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہو کر مشورہ دیا، اللہ کے رسولؐ ان کو معاف کر دیا جائے اور ان سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ جو فدیہ نہیں دے سکتے وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں ان کو آزاد کر دیا جائے۔ حضورؐ نے جو انسانیت کے لئے رحمت بن کر آئے تھے اس مشورے کو پسند کیا۔

غزوہ بدر میں شریک ہونے والے مجاہدین کا بڑا مقام اور مرتبہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ''جن لوگوں نے غزوہ بدر میں شرکت کی وہ جہنم میں نہیں جائیں گے۔'' (بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے بارے میں فرمایا اب تم جو بھی عمل کرو تمہارے لیے جنت واجب ہے تم کو بخش دیا گیا۔'' (بخاری)

☆☆☆

فرزانہ چیمہ

# قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے

ہندواورانگریز ہردومخالفین سے قانون کی جنگ لڑکر، اصولوں کی سیاست کر کے صداقت اور دیانت کی راہ اپنا کر قائداعظم محمد علی جناح نے اللہ کی نصرت اور مسلمانوں کی وحدت ومحبت کے سہارے دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھ دی۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کے خوبصورت نعرے نے مسلمانوں کے دل میں ایسی جڑ پکڑی کہ لاکھوں مسلمان مردوزن نے اسلامی خطہ ارضی کے لئے اپنے خون کے دریا بہا دیئے۔ لاکھوں اس خونی دریا سے پار نکل آئے۔ یہ خون کس لئے اور کس نے بہایا؟ پاک دل اور پاکباز مسلمانوں نے جن کا دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوقوم سے علیحدہ تشخص تھا، جن کی پیدائش، وفات، شادی بیاہ، کھانا پینا، عبادت وغیرہ ہر کام ہندودھرم سے الگ ہے۔ یقیناً اس خونِ ناحق کا حساب ہوگا حشر کے دن۔

ہماری قسمت کہ قائد اس ارض پاک کی آزادی کے تقریباً 13 ماہ بعد ہی وفات پا گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، پاکستان کے قیام کے اسباب اور اس کے مقاصد کے بارے میں مختلف مکاتب فکر بڑے ہی مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک مکتب فکر اس کے قیام کی اصل وجہ صرف معاشی ترقی وخوشحالی کا حصول قرار دیتا ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ اس کی غرض وغایت محض سیاسی آزادی تک محدود کر دیتا ہے۔ ایک گروہ ''قائداعظم سیکولر تھے'' کا راگ الاپتا رہتا ہے جبکہ ایک اور زیادہ مقبول عام مکتب فکر اس کے قیام کی بنیادی اور حقیقی وجہ اسلامی آئیڈیالوجی (اسلامی نظریہ) گردانتا ہے۔ سیکولر طبقہ قائداعظم کی 11 اگست 1947 کی تقریر کو اپنے حق میں بڑی شدومد سے استعمال کرتا ہے جو انہوں نے قانون ساز اسمبلی میں کی تھی۔ حالانکہ یہ تقریر مسلمانوں کی رواداری اور انسانی حقوق کے حوالے سے تھی۔ اس تقریر کے بعد بطور گورنر جنرل پاکستان قائداعظم نے بیسیوں دوسری تقریریں بھی کیں جن کا مطالعہ بھی ضروری ہے قابل غور بات ہے کہ تیرہ ماہ تک قائداعظم اس ملک کے سیاہ وسفید کے مالک رہے۔ عوام کے ہر دلعزیز قائد رہے۔ اس دوران انہوں نے ایسے کون سے اقدامات کئے جن سے ان کی سیکولرازم سے وابستگی ثابت ہوتی ہو۔ پس منظر سیاق وسباق اور عملی اقدامات سے ہٹ کر کوئی ایک تقریر کسی سیاسی شخصیت کے نظریات وافکار کا تعین کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔

قارئین کے ذوقِ سلیم کے لئے ہم اس وقت دو نادر تقریریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک نواب بہادر یار جنگ کی، جو انہوں نے قائداعظم کی موجودگی میں کی اور دوسری ایک نشری خطاب ہے جو قائداعظم نے آسٹریلیا کے عوام سے کیا۔ ان دو تقاریر سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے۔ (فرزانہ چیمہ)

## نواب بہادر یار جنگؒ کا خطاب

(آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدہ کراچی، دسمبر 1943)

برادران ملک! مسلم لیگ کا اجلاس ہو چکا اور حسب روایت قدیم میں آپ کو مخاطب کرنے کھڑا ہوا ہوں۔ اس اجلاس کو میں مسلم لیگ کی زندگی کا نیا باب تصور کرتا ہوں اور اس کی منظور کردہ چھ میں سے تین قراردادیں میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یعنی کونسل آف ایکشن کی قرارداد، پنج سالہ پروگرام بنانے والی کمیٹی کی قرارداد اور نئے الیکشن کے مطالبہ کی قرارداد۔ آخر الذکر کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔ صرف اسی قدر کہنا کافی تصور کرتا ہوں کہ میرے احباب، سرفضل حسین کی روح پرفتوح کے لئے چاہے کتنے شکر گزار ہوں پھر بھی اگر نئے الیکشن ہوئے بقول غالب

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

## صبحِ امید

مجھے دوسری دونوں قراردادوں کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔میں ان قراردادوں کو دورِنو کا آغاز،صبح امید کا نشان تصور کرتا ہوں، مسلم لیگ کے مستقبل کی درخشانی کی علامت مغیث ہوں اور داغ کے الفاظ میں اپنے قائد سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں: ؎

تیورترے اے رشکِ قمر دیکھ رہے ہیں
ہم شام سے اندازِ سحر دیکھ رہے ہیں

حضرات!مسلم لیگ کا احیاءاورترقی ایک فطری ترقی ہے جو بتدریج اور بہ استقلال عمل میں آئی اورآئندہ بھی جاری رہے گی۔اس نے ہماری سیاسی حیات کواچانک اور یکدم منقلب نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ ہمیں منزل کی طرف بڑھایا تا کہ ہمارا قدم آگے بڑھےاورہم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔

## دوقومی نظریہ

جس وقت قائداعظم نے لیگ کی زمام اپنے ہاتھوں میں لی، ہمارے دماغوں پرمختلف باطل تصورات چھائے ہوئے تھے۔ برادران وطن نے بہ انداز دوستی ہم کو یقین دلایا تھا کہ ہم دس کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں۔دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی کوئی جماعت اقلیت نہیں کہلاسکتی۔

تم ایک قوم ہو،مستقل قوم،جس کا خمیر اقوامِ عالم سے بالکل مختلف اور جدا ہے،جس کی بنیاد جغرافیہ اورنسل ورنگ کی ادنیٰ تفریقات سے بالاتر ہے۔

## اقبال کا خواب

جب مسلمانوں میں یہ خیال عام ہوگیا کہ ہم ایک اقلیت نہیں،ہم ایک مستقل قوم ہیں توانہوں نے ہمیں سمجھایا کہ جس ملک میں دوقومیں آباد ہوں اور دونوں کے مذہبی اور ثقافتی تصورات میں بعدالمشرقین ہوتو اس ملک میں جمہوریت صحیح طرزِحکومت نہیں ہوسکتی۔جب اس نظریئے نے بھی مسلم عوام کے قلوب میں جگہ پیدا کر لی تو قائداعظم نے اقبال کےخواب کوشرمندۂ تعبیر کیااور ہندوستان کے شمال مشرقی اورشمال مغربی علاقوں میں آزادمسلم ریاستوں کا مطالبہ کیا جس کواب عرف عام میں پاکستان کہتے ہیں۔

## نعرہ جنگ

آج سے تین سال پہلے خود ہم سے بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ پورا نہ ہوسکے گا،لیکن اب موجودہ حالات نے پاکستان کےعنقریب حاصل ہونے کا یقین پختہ کردیاہے۔مسلمان زیادہ سے زیادہ اس مطالبہ سے وابستہ نظرآرہے ہیں۔اب وقت آگیاہے کہ مسلم لیگ اس جنگ کی تیاری کا آخری قدم اٹھائے۔ اس نے دہلی میں حکومت برطانیہ کوآخری تنبیہ کی اورآج آل انڈیا مسلم لیگ نے کونسل آف ایکشن کی تجویز پاس کرکے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر پاکستان سیدھے ہاتھوں اورصلح وآشتی سے نہیں مل رہا ہےتو ہم یہ بزور بازوحاصل کریں گے۔

حضرات!وہ قائد یا سپہ سالار جس کے سپاہی مفلوج وناکارہ ہوں،کسی مہم کوکامیابی کے ساتھ سرنہیں کرسکتا۔اس کے لئے ضروری ہے کہ نعرہ جنگ بلند کرنے سے پہلے اپنی فوجی طاقت کا اندازہ کرلے۔ یہ کونسل آف ایکشن اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ وہ ہرایک صوبے میں نہ صرف اپنی طاقت کا اندازہ کرلی بلکہ نئی طاقت پیدا کرےاوراس کواس دن کے لئے تیار کرے جب قائد کی طرف سے کوچ کا حکم ملے۔

## میدانِ کارزار

مسلمانانِ ہند! جلسوں کا منعقد کرلینا،تجاویز پاس کرلینا،

تقریریں کرنا، تقریریں سننا کسی قوم کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کرسکتا۔ جہاں تک آپ کے ذہن اور فکر کی تربیت کا تعلق تھا، وہ منزل گزر چکی۔ اب عمل اور صرف عمل کا وقت ہے۔ اگر آپ اس کی طاقت نہیں رکھتے تو پاکستان کا مطالبہ کر کے اس کو ذلیل نہ کیجئے۔

قائداعظم! آپ مایوس نہ ہوں۔ آپ کے دوست اور پرانے ساتھی حضرت اقبال نے شاید آپ ہی سے مخاطب ہو کر کہا ہے:

اے رہبر فرزانہ مایوس نہ ہو ان سے
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

ممکن ہے آپ کو اس طبقے سے آپ کے کام کے آدمی نہ ملیں جس کو اعلیٰ طبقہ کہتے ہیں، لیکن آپ کی قوم جانباز سپاہیوں سے خالی نہیں ہے۔

## عہد وفا

قائداعظم! آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے میں اپنے آپ کو پیش کروں۔

## نذرانہ جان

قائداعظم! وہ دن میرے لئے عید کا دن ہوگا جس دن ملت محمدیؐ کے راستے میں اپنے گرہ کی آخری پائی اور اپنے خون کا آخری قطرہ نچھاور کر کے فخر و ناز کروں گا اور جس دن میرا جسم زخموں سے چور ہوگا۔ (مجمع سے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں)

اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ میں نے اپنے جس عزم کا اظہار آج کیا ہے وہ میرے بارہ سال کی شبانہ روز غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو دیکھو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو، اپنی زندگی کی ہر خوشی کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا بغور تصور کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو۔ مسلمانو! وہ فیصلے جو جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں، بسا اوقات آنی اور اسی لئے فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجر ملت پر پھول بن کر مہکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دھن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں جو کسی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں، جو محمدی ہوتے ہیں اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتے ہیں۔ ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر استحکام عمارت کی ضمانت دے سکتے ہوں۔ میں نے کل کہا تھا اور آج پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

## پاکستان کا تعمیری لائحہ عمل

حضرات! اس اجلاس کی دوسری خصوصیت پلاننگ کمیٹی پنج سالہ پروگرام یا لائحہ عمل مرتب کرنے والی جماعت کا قیام ہے۔ فارسی کا قول ہے

مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست

آج دنیا میں وہ لوگ بھی جو عالم گیر جنگ کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور جس کی فتح و شکست کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کیا جاسکتی، اس وقت جب کہ ان کی کشتی حیات گردابِ

فضا میں چکر کھا رہی ہے، ساحل کے نقشے تیار کر رہے ہیں، ہر جگہ تعمیر بعداز جنگ کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ ہم نے بھی پاکستان کو اپنے سامنے پاکر اگر پاکستان کے مستقبل، ترقی وخوشحالی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو حقیقت یہ ہے کہ بہت صحیح قدم اٹھایا ہے

## پاکستان کا دستوری نظام

حضرات! پاکستان کا حاصل کر لینا اتنا مشکل نہیں تھا، پاکستان کو پاکستان بنانا اور قائم رکھنا مشکل ہے۔ آپکے قائد نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی حکومتوں میں کسی دستور اور قانون کو خود مرتب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ ان کا دستور مرتب و متعین ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ قرآن پاک ہے۔ کتنی صحیح نظر اور کتنے صحیح فیصلے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہم پاکستان صرف اس لئے نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جگہ حاصل کرلیں جہاں وہ شیطان کے آلہ کار بن کر ان کی پٹی پر عمل کریں جس پر آج ساری دنیا کاربند ہے۔ ہمارے پاکستان کا یہی مقصد ہے تو کم از کم میں ایسے پاکستان کا حامی نہیں ہوں۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں قرآنی نظام حکومت قائم ہو۔ یہ ایک انقلاب ہوگا، یہ ایک نشاۃ ثانیہ ہوگی، یہ ایک حیات نو ہوگی جس میں خوابیدہ تصورات اسلامی ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیات اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی۔ پلاننگ کمیٹی آپ کے لیے جو دستوری اور سیاسی نظام مرتب کرے گی اس کی بنیادیں اگر کتاب اللہ اور سنت رسولؐ پر نہیں ہیں تو وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

(قائداعظم نے زور سے بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا "بالکل درست کہتے ہو")

## پاکستان کا تعلیمی نظام

اس پلاننگ کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانانِ ہند کو عموماً اور مسلمانان پاکستان کو خصوصاً پاکستان میں زندہ رہنے کے قابل بنائے اور پاکستان کے لئے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی نظام عمل مرتب کرے۔ دنیا جانتی ہے کہ دنیا کا کوئی انقلاب عملی صورت نہیں اختیار نہیں کرسکتا جب تک پہلے ذہنی حیثیت سے مکمل نہ ہوجائے۔ تاریخ عالم گواہی دیتی ہے کہ ہر انقلاب کو عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے ذہنی انقلاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاریخ انقلاب میں صرف محمدیؐ انقلاب ہی ایک ایسا انقلاب تھا جس نے بائیس برس کی قلیل مدت میں ان دونوں منزلوں کو طے کیا۔ ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کی ایک صورت تو یہی اجتماعات اور محفلیں ہیں لیکن انقلاب کو وجود میں لانے کا مستقلاً اور بنیادی ذریعہ صحیح اور مؤثر تعلیمی نظام کی ترویج ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی بدبختی یہی تھی کہ یہاں کا تعلیمی نظام اس قوم نے مرتب کیا جو نہ صرف ہندوستان کی سرزمین اور اس کے معاشی ذرائع پر قابض ہونا چاہتی تھی بلکہ اس کے ذہن وفکر پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہماری تاریخ کو اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کیا جس نے ہم میں خودفراموشی کو بڑھایا اور خوداعتمادی کو گھٹایا، جس نے ہماری مشرقی خصوصیات کو فنا کیا اور ہمیں مغربی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔ ضرورت ہے کہ مستقبل کے لائحہ عمل میں سب سے پہلا مقام تعلیمی نظام کو دیا جائے۔ ایسا تعلیمی نظام جس کی بنیاد کتاب اللہ وسنت رسولؐ پر ہو۔ جس نظام تعلیم سے گزرنے کے بعد مسلمان کا بچہ اسلامی نظام میں نشوونما پائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں ملت اسلامیہ کی صحیح

خدمت انجام دے سکے۔ میں اعلیٰ تعلیم کے مقابلہ میں ابتدائی تعلیم کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ ابتدائی تعلیم بنیاد ہے جس کی مضبوطی پر عمارت کے استحکام کا انحصار ہے۔ یاد رکھو قوم کی بدعملی صرف اخلاقی پستی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ اس قوم کی سیاسی غلامی کا سب سے بڑا سبب ہوتی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے وسائل اس کمیٹی کی کامیابی کے لئے استعمال کریں۔

## پاکستان کا معاشی نظام

دوسرا اہم مسئلہ جو اس کمیٹی کے دائرہ کار میں شامل ہوگا، آپ کی معاشی تنظیم کا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ کشمکش سرتاسر معاشی ہے، جولڑائی اس وقت لڑی جارہی ہے، اس کے اسباب پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشی اور صرف معاشی مسائل اس کی تہہ میں کارفرما ہیں۔

اسلام کا آفتاب دنیا پر اس وقت طلوع ہوا جب ایک طرف دنیا میں سیم وزر کے فلک بوس پہاڑ تھے اور اس کی دوسری طرف نکبت وافلاس کے عمیق غار نظر آرہے تھے۔ نام نہاد پیشواؤں نے مذہب کو آلہ کار بنا کر بنی نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور خود ساختہ اصول کے تحت اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز قائم کر رکھا تھا۔

شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ حضرت محمدؐ نے بہ جنبش لب لاالہ الا اللہ کہہ کر اس ہلال حق سے باطل کی ساری عمارتوں کو مسمار کر کے تبلیغ وتوحید سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان غاروں کو بھرا جو افلاس ونکبت نے پیدا کر دیئے تھے۔ انسانیت کی سطح ایک کر دی تھی۔ محمد عربیؐ کی محفل میں ہم بلال حبشیؓ کو ہم دوش ابوبکر صدیقؓ اور عمارؓ و یاسرؓ ہم نشین ابن خطابؓ دیکھتے ہیں۔ امتناع سود سے سرمایہ داری کی جڑیں کٹ گئیں۔ وراثت کے قانون نے دولت جمع ہونے کے راستے روک دیئے۔ زکوٰۃ نے اس دولت کو جو کسی نہ کسی طرح ان موانع کی موجودگی میں جمع ہوتی ''جبراً''، تقسیم کر دیا اور ارتکاز دولت کا خاتمہ کر دیا۔ جمع مال کی مذمت اور نفاق فی سبیل اللہ کی تلقین نے مدینہ میں عہد رسالتؐ کے آخری ایام کو مسکین کے وجود سے خالی کر دیا۔ الارض للہ کا قرآنی پیغام سنا کر نبی امی نے زمین کی ملکیت صرف خدا اور اس کے خلیفہ یعنی اسلامی سٹیٹ کے لئے مخصوص کر دی۔ نہریں، جنگل، معدنیات وغیرہ یہ سب سٹیٹ کی مشترک ملک قرار پائے اور کسی فردِ واحد کو یہ حق نہ رہا کہ ان کے ذریعہ دولت کے ڈھیر جمع کرے۔ زکوٰۃ کے تعلق سے اجمالاً واشارتاً یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ اسلامی ٹیکس آمدنی پر وصول نہیں کیا جاتا بلکہ سرمایہ سے وصول کیا جاتا ہے اور ان سارے ٹیکسوں سے بڑھ جاتا ہے جو آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد انسانیت نے اپنی ترقی یافتہ ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر وضع کیے ہیں۔ کیا اس نظام کی موجودگی میں کسی اور معاشی نظام کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہے؟

میں محسوس کر رہا ہوں اور پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ روس کی اس جنگ میں انگلستان کے ساتھ شرکت نے ہندوستان کے لئے کمیونزم کی تبلیغ اور دعوت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور کمیونسٹ مبلغین کو موجودہ گرانی اور قلت اجناس نے موقع بہم پہنچایا ہے کہ غریبوں کے سامنے روٹی اور کپڑے کا نعرہ بلند کر کے ان کو کمیونزم کی طرف گھسیٹیں۔ میں اپنے نوجوانوں کو ہندو نوجوانوں سے زیادہ اس مذہب معاش کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ رہا ہوں۔ اگر کمیونزم کے معنی صرف یہ ہیں کہ دنیا سے غربت وافلاس کو مٹایا جائے اور ہر انسان کو روٹی اور کپڑا مہیا کیا جائے تو میں اپنے آپ کو سب سے بڑا کمیونسٹ کہہ سکتا ہوں اور اگر اس کے پیچھے یہودی کارل مارکس کا وہ فلسفہ کام کر رہا ہے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے انکار پر ہے تو میں کمیونزم سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

اسلام کی بنیاد وجودِ باری کے عقیدے پر رکھی گئی ہے اور اگر مسلمان اس سے ہٹ رہا ہے تو اسلام سے ہٹ رہا ہے، سیدھے راستے سے ہٹ رہا ہے، خیر سے ہٹ کر تباہی کے غار میں گرنا چاہتا ہے۔ میں اس اجلاس میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پنڈال سے وہ لوگ اٹھ جائیں جو خدا کے انکار پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں، قرآن کے واضح اور اٹل احکامات میں تحریف واضافہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور جو روٹی کپڑے کے بدلے مسلمان کا ضمیر اور اس کا ایمان خریدنا چاہتے ہیں۔ (مجمع سے بے پایاں شور بلند ہوتا ہے ''ہم صرف اسلامی نظام چاہتے ہیں'')

مجھے یقین ہے کہ ہماری پلاننگ کمیٹی جب پاکستان کے لیے معاشی نظام مرتب کرے گی تو اس کی بنیاد قرآن و اسلامی نظام معیشت پر ہوگی۔ (قائداعظمؒ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے)

## جناب قائداعظم!

میں نے پاکستان کو اسی طرح سمجھا ہے اور اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے۔

(قائداعظم نے مسکراتے ہوئے فرمایا: آپ مجھے قبل از وقت کیوں چیلنج کر رہے ہیں)

نہیں قائداعظم! میں چیلنج نہیں دے رہا ہوں۔ میں اس چیلنج کے ذریعے آپ کے عوام کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ آپ ایسا ہی پاکستان چاہتے ہیں جس کا اس وقت اجمالی تصور پیش کیا گیا ہے۔

## نشاۃ ثانیہ

برادران ملت! یاد رکھیے پلاننگ کمیٹی کا تقرر آپ کی سیاسی زندگی کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ وہ قوم جو تعلیمی اور معاشی حیثیت سے آزاد نہ ہو، سیاسی حیثیت سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتی۔ تعلیمی اور معاشی غلامی کے ساتھ سیاسی آزادی غلامی کی بدترین قسم ہے۔

اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب خصوصیت سے مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ کر کے اگر آپ ایسا ملک چاہتے ہیں جس میں پاک لوگ بستے ہوں تو میرے دوستو یاد رکھو کہ جسمانی ناپاکی دور ہوسکتی ہے اور آسانی سے دور ہوسکتی ہے لیکن ذہن وفکر اور قول وعمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے جس کو دور کرنے کیلئے اللہ نے انبیاء جیسی ہستیاں پیدا کی ہیں۔ وہ اسی وقت دور ہوسکتی ہے جب نبی کی اتباع کی جائے۔ کیا ان ناپاکیوں میں آلودہ ہو کر جھوٹ کو اپنا شعار بنا کر، مکر وفریب میں مبتلا ہو کر ظلم واستبداد کو جاری رکھ کر، کیا ہم یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں گوشوں میں خودمختار حکومت مل بھی گئی تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہوگی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے۔ مکر وفریب کی سیاست طالبانِ پاکستان کی سیاست نہیں ہوسکتی۔

آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک بنانا شروع کردے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہوجائے۔

(ماخذ: تصور پاکستان بانیانِ پاکستان کی نظر میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد 2005)

## آسٹریلیا کے عوام سے قائداعظمؒ کا نشری خطاب

(19 فروری 1948)

''آج کل یہ بات زبان زدخاص وعام ہے کہ دنیا سمٹتی جارہی ہے۔ اس کے باسی ایک دوسرے کے متعلق زیادہ جانتے ہیں اور ان کے مفاد ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے جارہے ہیں۔ تاہم مجھے شبہ ہے کہ آسٹریلیا کے لوگ پاکستان کے بارے میں شاید ہی کچھ جانتے ہوں گے۔ میں سوچتاہوں کہ کیا یہ ایک نام سے کچھ زیادہ ہوگا؟ کیا یہ ناقابل اندزہ لوگوں، ایشیائیوں کا ایک پرانا اور کچھ ناقابل فہم سا تجربہ تو نہیں؟ آج مجھے بے حد مسرت ہے کہ مجھے آپ کو پاکستان کے بارے میں کیا کچھ بتانے کا موقع ملا اور یہ بھی کہ ساڑھے ۶ کروڑ انسانوں کے لئے اس کا مفہوم کیا ہے۔

پاکستان دوحصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ برصغیر ہند کے شمال مشرق میں اور دوسرا شمال مغرب میں واقع ہے۔ مشرقی حصے کی زمین بڑے آہستہ خرام دریاؤں سے سیراب ہوتی ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار مون سون کی بارشوں پر ہوتا ہے۔ مغرب میں واقع علاقوں میں زیادہ تنوع ہے۔ ان میں صحرا ہیں۔ زرخیز اور نہروں سے سیراب ہونے والے میدان ہیں۔ پہاڑ ہیں اور وادیاں۔ لوگ زیادہ تر سیدھے سادے اور غریب، زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں، اپنے سلسلے میں کاشتکاری سے آگے شائد ہی ان کی کوئی اور دلچسپی ہو۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ غریب ہیں لیکن ان کا تعلق ایک سخت کوش اور جفاکش نسل سے ہے اور میں مغیث ہوں اس دعوے میں کوئی شیخی نہیں ہوگی کہ وہ بہادر ہیں، انہوں نے اچھے سپاہی پیدا کئے اور بہت سی جنگوں میں معرکے مارے۔ دونوں عالمی جنگوں میں انہوں نے آپ کے شانہ بشانہ داد شجاعت دی۔ فی الوقت ہمارا تمام تر انحصار زراعت پر ہے۔ پاکستان کی آبادی تو سابق برطانوی ہند کی ۲۲ فیصد کے لگ بھگ ہوگی مگر اس کی پیداوار چاول کے معاملے میں کل پیداوار کی ۳۳ فیصد اور گندم کے معاملے میں کل پیداوار ۴۰ فیصد ہے۔ لہٰذا مقابلتاً خوش نصیب ہیں۔ ہماری چند اور بھی تجارتی پیداواری فصلیں ہیں۔ مثلاً پٹ سن، کپاس اور تمبا کو۔ دنیا کا بیشتر پٹ سن مشرقی بنگال میں پیدا ہوتا ہے اور اس سے ہمیں بہت بیرونی زرمبادلہ حاصل ہوجاتا ہے۔ بیرونی زرمبادلہ ہمارے لئے بہت اہم ہوگا کیونکہ اس سے صنعتیں قائم کی جاسکیں گی اور ان کی توسیع ہوسکے گی۔

اب تک ہمارے ہاں چند ہی بڑی صنعتیں ہوں گی۔ میں مغیث ہوں کہ آسٹریلیا کے ایک مایہ ناز سپوت، میری مراد ہے مسٹر آر جی کیسی سے، آپ کو یہ بتا سکیں گے کہ ہمارے ملک میں ترقی اور خوش حالی کے بے پناہ مواقع موجود ہیں اور یہ کہ ہم خود یعنی عوام ان مواقع سے استفادہ کے لئے بیتاب ہیں۔ تاہم اس وقت ہمارے پاس سرمائے اور تیکنیکی معلومات کی کمی ہے۔ لیکن تھوڑا سا وقت درکار ہوگا۔ اِدھر اُدھر سے دوستانہ تعاون کا ہاتھ بڑھا تو یہ کمی بھی پوری ہوجائے گی۔ صنعت کاری اور افزائش سرمایہ کے ضمن میں نہ ہم تعصّبات کے شکار ہیں اور نہ ہی جھوٹی انا کے، ان جہتوں میں ہمیں اپنی کمزرویوں کا علم ہے اور ہم ایسی سرمایہ کاری کا خیرمقدم کریں گے جو ہماری معیشت کے استحکام کا باعث بن سکے۔ میں نہیں مغیث کہ بیرون ملک سے اگر کسی نے دست تعاون دراز کیا تو اسے پچھتاوے کی کوئی وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ہزار میل کے قریب بھارتی علاقہ ہے۔ بیرونی ملک کا کوئی بھی طالب علم سب سے پہلے یہ سوال کرسکتا ہے کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ ایسے علاقوں کی حکومت میں جن کے درمیان اس قدر طویل فاصلہ حائل ہو اتحاد عمل کیسے ہوسکتا ہے؟ میں اس سوال کا ایک لفظ میں جواب دے

سکتا ہوں، اور وہ ہے ''ایمان''۔ ایمان اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر، اپنے اوپر اعتماد اور اپنے مقدر پر بھروسہ۔ لیکن میں مغیث ہوں کہ جو لوگ ہم سے واقف نہیں ہیں انہیں اس مختصر سے جواب کے مضمرات کو سمجھنے میں شاید دقت محسوس ہو۔ لیجئے میں آپ کے سامنے تھوڑا سا پس منظر بیان کر دیتا ہوں۔''

ہماری عظیم اکثریت مسلمان ہے۔ ہم رسول ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ ہم اسلامی ملت برادری کے رکن ہیں جس میں حق، وقار اور خودداری کے تعلق سے سب برابر ہیں۔ نتیجتاً ہم میں اتحاد کا ایک خصوصی اور گہرا شعور موجود ہے۔ لیکن غلط نہ سمجھئے، پاکستان میں کوئی نظام پاپائیت رائج نہیں۔ اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ہم سے دیگر عقائد کو گوارا کرنے تقاضا کرتا ہے اور ہم اپنے ساتھ ان لوگوں کے گہرے اشتراک کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں جو خود پاکستان کے سچے اور وفادار کی حیثیت سے اپنا کردار کرنے کچھیا آمادہ اور رضامند ہوں۔

نہ صرف یہ کہ ہم میں سے بیشتر لوگ مسلمان ہیں، بلکہ ہماری اپنی تاریخ ہے، رسوم وروایات ہیں اور وہ تصورات فکر ہیں، وہ نظریہ اور جبلت ہے جس سے قومیت کا شعور ابھرتا ہے۔ ہند میں صدیوں سے ہمارا ایک مقام تھا۔ کسی وقت وہ مقام اعلیٰ وارفع تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مغلوں کا فرمان ساحل تا بہ ساحل جاری وساری تھا۔ ہم اس عہد کو صرف تاریخی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اب ہمارے پاس مقابلتاً کم علاقہ ہے جو بلحاظ رقبہ انگلستان سے چار گنا ہے۔ یہ ہمارا ہے اور ہم اس پر قانع ہیں۔ ہم اپنے ہمسایوں کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم صلح وآشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم سکون کے ساتھ اور اپنے طریقے سے اپنے مستقبل کو سنوارنا چاہتے ہیں اور امور عالم میں اپنا جائز حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے عوام کی اپنے لئے علیحدہ خطہ ارض حاصل کرنے کی خواہش عظیم مصائب برداشت کئے بغیر پوری نہیں ہوئی۔ آپ نے اخبارات میں ان ہولناک واقعات کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا جو شمالی ہند میں رونما ہوئے۔ ہمارے لئے وہ ایک اخباری واقعہ نہیں تھا۔ یہ قیامت تھی۔ ہمارے عزیز واقربا کا خون ناحق، ہم میں سے کوئی بھی خواہ وہ پاکستان کا ہو یا ہندوستان کا اس واقعہ کا تذکرہ گہرے رنج الم کے بغیر نہیں کرسکتا۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے تہ تیغ کر دیئے گئے۔ لاکھوں بے گھر ہوگئے۔ ہنگامہ ایک بار شروع ہوگیا تو طرفین کے لوگوں نے ایک دوسرے پر جوابی حملے کئے اور مجھے امید ہے کہ اب وہ شرمسار ہوں گے۔

میں قطعی طور پر اپنی حکومت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ ہم نے حتی المقدور خلاف قانون جذبہ انتقام کو دبانے کی کوشش۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن میں صدق دل سے شکر بجا لاتا ہوں کہ ہم اپنے مقصد میں بہت بڑی حد تک کامیاب رہے۔ ہمیں سب سے زیادہ جس کی ضرورت ہے وہ امن وسکون اور عمدہ میل ملاپ ہے۔ میں پاکستان کے ہر فرد کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے مصائب نے جو بے حد ہولناک تھے ہم میں اپنی مملکت کو برقرار رکھنے اور اسے عظیم نعمت تصور کرنے کے عزم کو پختہ تر کر دیا ہے۔ اپنے عام خطبات میں اور حکومت کے ہر اس شعبہ کو بھی جس پر میرا اثر ورسوخ ہے میں نے یہ تاکید اور ہدایت کی ہے کہ نہ پاکستان کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا ہے اور نہ اپنے زخموں کو سہلاتے رہنا ہے۔ ہمارے عوام کو اپنے ملک کی بہتری اور اسے مالا مال کرنے کے لئے کام کرنا چاہیے اور محنت سے کرنا چاہیے۔

اپنی نئی مملکت کے قیام کے سلسلے میں میں یہ توقع کرتا ہوں کہ آسٹریلیا کے عوام کو ہمارے مسائل کا خصوصی

اندازہ ہوگا کیونکہ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں کہ آپ کے آباواجداد بھی نئی بستیاں بسا رہے تھے، انتظامیہ کی تشکیل کرر ہے تھے، زمین کے خزانوں کو ترقی دینے کے منصوبے بنار ہے تھے، اپنے بچوں یعنی آپ کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی تدابیر کرر ہے تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ آسٹریلیا کے باشندوں کی حیثیت سے اپنی شناخت کا شعور حاصل کرر ہے تھے جو آپ نے ان سے ورثے میں پائی۔ کم وبیش ہم آج اسی مرحلہ میں ہیں۔ بلاشبہ غلطیاں کریں گے، شاید اسی طرح جس طرح آپ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی، لیکن جس طرح آپ کامیاب ہوئے ہم بھی کامیاب ہوں گے۔

ایک اور سبب بھی ہے جس کے باعث میں مغیث ہوں کہ آپ پاکستان کو پہلے ہی سے پرہجوم نقشہ پر محض ایک اور نام تصور نہ کریں۔ دراصل پاکستان مسلم ممالک کی طویل صف میں ایک نہایت اہم اضافہ ہے، جس راہ سے آپ کی بحیرۂ روم اور یورپ تک رسائی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر ہمارا ان ممالک کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔

میں مغیث ہوں کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں کافی یگانگت موجود ہے۔ شاید یہ عملی اعتبار سے فکر اور محض نظریاتی باتوں اور جذبات سے مبرا رہنے کا نتیجہ ہو۔ بلاشبہ کبھی کبھار اونچ نیچ، مشکلات اور غلط فہمیاں بھی ہوئی ہوں گی، لیکن یہ چیزیں دوستی کے مقابلے میں اتنی اہم نہیں۔ یقیناً پاکستان میں ان لوگوں کے دلوں میں جو برطانوی قوم سے بخوبی واقف ہیں، نیک جذبات کے سوا کچھ نہیں۔ گزشتہ عشرے کے دوران جب ماحول میں ذرا گرمی تھی تو ہم نے برطانوی حکمرانی اور ان کے طریقہ فرمانروائی کے بارے میں تلخ باتیں کیں، وہ وقت اب گزر چکا ہے، اور اپنی آزادی کے حصول اور قیام پاکستان اور دوستانہ معانقہ اور دو برابر کی قوموں کے مابین رابطے کے پس منظر میں فراموش بھی ہو چکا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس مختصر سی گفتگو میں میں نے اس بارے میں کہ پاکستان اور اس کے عوام اور ہم سب کے لئے پاکستان کا مطلب کیا ہے، ایک ہلکا سا خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں بات ختم کرتے ہوئے آسٹریلیا کے عوام کو ہدیہ تہنیت بھی پیش کر دوں، میں بڑی مسرت کے ساتھ ایسا کر رہا ہوں اور اس سے بہتر تہنیتی پیغام میں سوچ ہی نہیں سکتا جو ہمارے یہاں روایتاً رائج ہے، یعنی ''السلام علیکم''، جس کا مطلب ہے ''تم امن وسلامتی سے رہو۔''

پاکستان زندہ باد

(ماخذ: قائداعظم تقاریر وبیانات، جلد چہارم خورشید احمد یوسفی، ترجمہ اقبال احمد قریشی لاہور بزم اقبال 1998)

☆☆☆

# دعا

## قطعات

قلزم خوں میں مچلتا ہے نشہ بن بن کے
کعبۂ دل میں اترتا ہے خدا بن بن کے
حدِ امکاں میں کہیں ملتا نہیں جس کا پتہ
وہ بلاتا ہے سوئے زیست صدا بن بن کے

☆

کیا عجب بات ہے کہ اب کے بہاروں میں بھی
پھول جوڑے میں لگانے کو ملے کاغذ کے
چھوڑ دی مانگنا لوگوں نے دعا بارش کی
در دریچوں میں چمن جب سے کھلے کاغذ کے

☆

ساتھ تیرا ایک پل کو مانگ کے
عمر بھر کی مانگ لیں تنہائیاں
دھوپ میں بھی تو رہا غیروں کے سنگ
پا سکے ناں ہم تیری پرچھائیاں

☆

نگاہِ دوست نے روشن دل ودماغ کیا
کلی کو اسطرح چھیڑا کہ باغ باغ کیا
چھپایا چاندنے ہر داغ اپنے سینے میں
کسی طرح سے نہیں چاندنی کو داغ کیا

☆

نہ نیند آئی نہ خواب اترے
نہ چاہتوں کے حجاب اترے
بجھا گئے جو بصارتوں کو
دہکتے وہ آفتاب اترے
کسی کی مرجھائی شاخِ دل پہ
گئی رتوں کے عذاب اترے

نجمہ یاسمین یوسف

# غزل

کس نے میری پیشانی پر دکھ سکھ لکھے ہیں
کس نے میرے آنچل میں یہ جگنو باندھے ہیں

میرے دل کو دھڑکن کی لے کس نے بخشی ہے
کس نے مجھ کو آنکھوں کے نذرانے بانٹے ہیں

کس نے دل کے صحرا میں امیدُ گائی ہے
کس نے آنکھوں کے دریا میں خواب اتارے ہیں

کس نے مانگ بھری ہے دن کی اجلے سورج سے
کس نے رات کے آنچل میں یہ تارے ٹانکے ہیں

کس کے آگے جھکی ہوئی ہے دنیا کی ہر شے
کس کے آگے شاہ و گدا سب ہاتھ پسارے ہیں

کس کے حکم پہ ہلکے پھلکے اڑتے بادل نے
اپنی پیٹھ پہ پانی کے مشکیزے لادے ہیں

زرد ہوائیں کیسے ان تک آن پہنچتی ہیں
کیسے دل میں خواہش کے یہ گل مرجھاتے ہیں

کیسے دل کی دیواروں میں نمی اترتی ہے
آنکھوں میں اک ٹیس پہ آنسو کیسے آتے ہیں

سرحد کے اُس پار سے کیسے یادوں کے پنچھی
اڑتے اڑتے دھیان کے پیڑوں پر آجاتے ہیں

کبھی کبھی یہ درد ہمیں کیوں دیتا ہے آرام
کبھی کبھی یہ آنسو کیوں موتی بن جاتے ہیں

ایک ذرا سی آہٹ ہم کو کیوں چونکاتی ہے
خوفزدہ کیوں ہوجاتے ہیں کیوں ڈر جاتے ہیں

مدہم پڑجاتی ہیں اک دن ساری تصویریں
سامنے والے سارے چہرے دھندلا جاتے ہیں

☆......☆......☆

(غزل کی طوالت آپکو کھٹکے تو اور بات ہے، فکر و آلام، خون و دشنام، ذہن میں برپا ہنگام سے وقتی طور پر چھٹکارا پانے کے لئے، تسکین طبع کے لئے یہ غزل بھیج رہی ہوں 14 جون کی گرم اور بوجھل صبح۔)

**شمیم فاطمہ**

# مثالِ آئینہ دار

شہر کے مشہور ترین بیوٹی پارلر سے دلہن میک اپ کروا کے جب عنزہ نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو وہ خود کو بھی پہچان نہ پائی۔ بہت دیر تک وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن رہی۔ سچ کہتے ہیں پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، یہ بدصورتی کو خوبصورتی کا پہناوا پہنا سکتا ہے، سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا سکتا ہے، یہ وہی عنزہ ہے......پھینی ناک اور قدرے سانولے رنگ والی عنزہ!!

بیوٹیشن ہاتھ چلاتے ہوئے زبان کا استعمال بھی ایک لمحہ کچھیا نہ بھولی۔ ''کیا شاندار سکن ہے تمہاری......ایسی سکن پر میک اپ کا مزہ ہی آ جاتا ہے!!''

اس طرح کے درجن بھر فقرے عنزہ کی قوت سماعت سے ٹکرائے پہلے پہل تو اس نے سوچا شاید ہر اچھے دکاندار کی طرح گاہک کو فرش سے عرش پر لے جانے والا معاملہ ہے لیکن اسے یاد آیا ابھی پچھلے دنوں ماریہ آپی کی نند کا میک اپ کراونا تھا تو سو طرح کے معترضہ جملے انہوں نے شاندانہ بیوٹی پارلر کی روزینہ عروج کی بدمزاجی کے سنائے تھے۔

آئینے سے نظر ہٹائی تو اس نے اپنے لباس پر نظر ڈالی۔ شہر کے مشہور شاپنگ مال سے خریدا گیا عروسی جوڑا!!!اس نے پھر اپنے آپ سے سوال کیا ''عنزہ بی بی! معمولی سے سرکاری ملازم کی بیٹی ہونے کے ناطے کیا یہ سب تم افورڈ کر سکتی تھیں؟'' دل و دماغ نے بیک وقت جواب دیا ''نہیں۔''

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟ بہترین عروسی جوڑا بہترین میک اپ اور بہترین زیور۔''

اک ننھا منا سا آنسو اسکی دائیں آنکھ کے گوشے سے گرا اور اسکی ناک کی لونگ میں گم ہو گیا۔

یہ آنسو......فقط ایک آنسو......اس وقت اسکا ترجمان تھا۔ اسکے جذبات کا، اسکے احساسات کا......اور روئیں روئیں سے ادا ہونے والے شکرمندی کے جذبات کا!

اگر میم راشدہ نہ ہوتیں تو کیا یہ سب ممکن تھا!! اسکے صاف شفاف دل میں میم راشدہ کچھیا مزید شکرگزاری شامل ہو گئی اور بات یہ ہے کہ شکرگزاری انسان میں مزید عاجزی پیدا کرتی ہے سو اس وقت وہ سرتاپا میم راشدہ کچھیا نیازمند تھی۔ انہوں نے اسکی تعلیم، اسکے اخراجات، اسکی ٹیوشن میں ہی مدد نہیں کی تھی بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں اسکی یوں راہنمائی کی کہ راہیں کھلتی چلی گئیں، مسئلے حل ہوتے گئے۔ یہ خصوصی رویہ صرف عنزہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ہر سٹوڈنٹ کچھیا خواہ اسکا تعلق گاؤں سے ہو یا شہر سے وہ کسی صنعتکار کی بیٹی ہو یا ٹھیلے والے کی۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عنزہ پر یہ دست شفقت اس لئے تھا کہ وہ اسکے حالات سے ذاتی طور پر واقف تھیں۔ معمولی شکل وصورت اور اوسط درجے کے ذہن والی عنزہ ان کے مشوروں پر عمل کر کے آگے بڑھتی چلی گئی۔ منزل جھک کر اس کے قدموں میں حاضر ہو گئی۔

اپنی پینتیس سالہ ملازمت میں کوئی ایک شاگرد بھی تو ایسی نہ تھی جسے میم راشدہ سے حرف شکائت ہو! جس کا دل میم راشدہ کی محبت میں نہ دھڑکتا ہو جس نے میم راشدہ کے ہر سٹائل کی خواہ وہ دوپٹہ کا ایک پلو دائیں کندھے پر لٹکانا ہی کیوں نہ ہو، یا ان کے بولنے پڑھانے کا ہو، کاپی نہ کی ہو، ہر دل عزیز لفظ تو لغت میں صرف ان کچھیا ہی استعمال ہوتا تھا۔ اگر کسی بچے کو کوئی میڈل، سرٹیفیکٹ، شیلڈ ملتی تو خواہ میم راشدہ اس وقت اسکے ساتھ ہوں یا نہ ہوں آئیڈیل ٹیچر کے فریم میں وہ میم راشدہ کا نام ہی فٹ کرتا۔

لازوال دھیمی مسکراہٹ، مناسب ہیل کا جوتا، خوبصورت سا ہینڈ بیگ...... یہ تین چیزیں ہمہ وقت ان کے ساتھ ہوتیں۔ کلاس روم میں داخل ہوتیں تو لازوال محبت، خصوصی شفقت بھی شامل ہو جاتی۔ انکے دل کی طرح انکے خوبصورت گھر کا دروازہ ہر وقت ہر شاگرد کچھیا کھلا رہتا۔ انکی شخصیت کچھیا عنزہ کے دل میں بس ایک خیال آتا ''بلاشبہ ایسی منتخب ہستیاں آئے دن پیدا نہیں ہوتیں۔''

ہائیر سکینڈری سکول میں زندگی کے بارہ سال اس نے میم راشدہ کے متفنی بھرپور اور یادگار گزارے۔ زندگی کے اگلے مرحلے میں اسے مزید تعلیم کے لئے دوسرے شہر منتقل ہونا پڑا لیکن وہ کبھی بھی میم راشدہ سے رابطے میں غافل نہ ہوتی۔ اسکے چاروں طرف میم راشدہ کی یادیں تھیں۔ کبھی کسی ٹیچر کی مسکراہٹ سے انکی یاد دل میں منہرں لینے لگتی اور کبھی کسی کے چلنے بولنے کا انداز ان کی یاد کا خزانہ سمیٹ لاتا یوں یہاں سے گریجویشن مکمل کر کے وہ واپس گھر پہنچی تو میم راشدہ اپنے اکلوتے بیٹے حبیب ناصر کا رشتہ لے کر پہنچ چکی تھیں۔

رشتہ طے ہونے سے نکاح تک کے مراحل میں دوسال لگے اور یہ دوسال کا عرصہ میم راشدہ سے ذہنی ہم آہنگی کی تکمیل کا زمانہ تھا۔

میم راشدہ کے گھر والوں کو کون سی چیز پسند ہے اور کون سی ناپسند۔ کس کا مزاج کس بات پر برہم ہوتا ہے، کب سوتے ہیں اور جاگنے کے اوقات کس کے کیا ہیں؟ یہ سب چھوٹی چھوٹی معلومات اسے ازبر ہو چکی تھیں۔

اپنے گھر کی دہلیز پار کرنے میں اسے دکھ ضرور تھا اذیت یا خوف بالکل نہیں۔ جہیز کے نام پر ایک تنکا تک وصول نہیں کیا گیا۔ ہنستے مسکراتے بس ایک ہی بات کہی۔ ''اپنی بیٹی کو دینے کے لئے کوئی چیز پسند کریں تو قیمت کا سٹکر ضرور لگادیں، قیمت ادا کیے بغیر وہ چیز نہیں لیں گے!!''

نکاح کا جوڑا، جوتا، زیور سب میم راشدہ نے پہلے سے عنزہ کے ماں باپ کے سپرد کر دیئے تھے۔ میک اپ کچھیا کسی کو بھی پیسہ دھیلا خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ شاندانہ بیوٹی پارلر کی مالکہ اور جملہ سٹاف سب کی سب میم راشدہ کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ یہ تو افسانوں میں پڑھتے ہیں کہ آئیڈیل مرد مل گیا، آئیڈیل گھرانہ کسی کو ہی ملتا ہے۔ یوں عنزہ آج آئیڈیل گھرانے کی بہو بننے جا رہی تھی!!

☆......☆......☆

عنزہ میری ہونہار شاگرد رہ چکی ہے۔ حبیب کے رشتے کچھیا اسے پسند کرنے کی بلامبالغہ درجنوں وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہی وجہ بہت اہم ہے کہ عنزہ فطرتاً بہت سادہ مزاج ہے، کسی پر نکتہ چینی یا ناک منہ چڑھانے کی عادت سے کوسوں دور۔ پھر یہ کہ ہنس مکھ بھی ہے، کسی چیز کی بظاہر ٹینشن نہیں لیتی۔ مزاج میں تدبّر کا پہلو نمایاں ہے، کسی وقت کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا، نوجوان بچیوں میں یہ شعور کم ہی

ہوتا ہے۔ سٹریٹ فارورڈ کے خوبصورت عنوان سے ہر چھوٹے بڑے کے بخیے ادھیڑ کے رکھ دیتی ہیں یا ''ہو کیئرز'' کا ٹیگ ماتھے پر لگا کر گونگے کا گڑ منہ میں ڈال لیتی ہیں۔ بات پوچھو، جواب میں کندھے اچکا کر اپنے سٹیٹس کا اظہار کرتی ہیں۔

ایک اور خوبی عنزہ کی ذات کا نمایاں حصہ ہے وہ یہ کہ اسے رشتوں کے احترام کے تقدس کا علم ہے۔ باؤ جی (کلرک) ہوں یا بابا مالی، ان سے بات کرتے ہوئے اسکے لہجے میں احترام اور ٹیچرز سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ مودّب ہو جاتا۔ کلاس فیلوز سے خوش دلی سے بات کرتی اور اپنی سینئرز سے اسکی باتوں میں مرعوبیت ہوتی۔ اس کی باتوں سے گلوں کی خوشبو آتی اور اسکے کاموں سے دل و جان تک خوشی کی لہر دوڑ پڑتی۔

اپنے تعلیمی کیرئر کے بارہ سالوں میں اس نے کسی کو مایوس نہیں کیا۔ جو اہداف رکھے جاتے وہ مسلسل محنت سے پہنچ جاتی۔ خاندان میں بڑی بیٹی ہونے کے ناطے اسکی فطرت میں ذمہ داری اور خاندان میں سفید پوشی نے اسے سنجیدگی عطا کر دی ہے۔ شوبازی اور ریاکاری سے الگ تھلگ، ہر ایک سے پیار کرنے والی......

حسن کردار ہی وہ چیز ہے جو معمولی سے معمولی شکل وصورت میں ''کشش'' پیدا کر دیتا ہے۔ سو اسکے عام سے نقوش میں بھی ایسی جاذبیت ہے کہ دیکھنے والا فوراً نظریں نہیں ہٹا پاتا۔

اسکی چال میں تمکنت اور وقار اور گفتگو میں شائستگی ہے۔ مختصراً یوں کہیے کہ حسن کردار اور حسن گفتار کو جمع کیا جائے تو عنزہ بنتی ہے اور میں فخر یہ کہتی ہوں کہ عنزہ جیسی بچیاں فطرت کبھی کبھار ہی تحفتہً دیا کرتی ہے۔ ہاں سچ یہ بتانا میں بھول گئی کہ حبیب میرا اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود دس خوبیوں کے ساتھ بیس خامیاں بھی رکھتا ہے۔ بڑبولا، کچھ شکی مزاج، جلد سیخ پا ہونے والا۔ میں نے سوچا ایسے مزاج کے حامل بیٹے گچھیا عنزہ بہتر رہے گی کہ وسعت قلبی شک کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ خوش مزاج انسان، بدمزاجی کو بھی سہہ جاتا ہے۔

ہر لحاظ سے بہت اچھی عنزہ آج میری بہو بن کر میرے آنگن میں داخل ہونے والی ہے۔

☆......☆......☆

آج میری حبیب سے شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ یہ سال زندگی میں یادگار سال تھا۔

میرے سسر ناصر محمود کم گو، کام سے کام رکھنے والے انسان ہیں۔ پورے سال میں انکا کردار بے ضرر سا رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں نے ان کو اپنے سامنے بات چیت نہیں کرتے دیکھا۔ اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ میں نے انہیں گھر کے کسی بھی معاملہ میں دلچسپی لیتے بھی نہیں دیکھا۔ ان کا بیڈروم بالکل الگ تھلگ ہے اور میری ساس یعنی میم راشدہ کا بالکل الگ ......وہ سیاہ کریں یا سفید، میرے سسر نے کبھی نوٹس نہیں لیا۔ شادی بیاہ، خوشی غمی میں میں نے اپنی ساس کو اکیلے ہی جاتے دیکھا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میری ساس جو کماتی ہیں وہی خرچ کرتی ہیں اس لئے کہ میں نے انہیں معمولی سے معمولی چیز کا حساب کتاب روزنامچے میں درج کرتے دیکھا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انیسویں گریڈ کے وہ سرکاری ملازم جن کا رہن سہن شاہانہ اور لاکھوں کروڑوں میں کھیلتے ہیں وہ ساری کمائی کہاں کرتے ہیں؟ دو چار گرمیوں کے دو چار سردیوں کے مخصوص سوٹ اور بس۔

لیکن ایک بات ہے میں نے ان کے اندر کھٹ پٹ یا چپقلش نہیں پائی اس لئے کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں بتایئے

اب میں کس سے پوچھوں؟ جھجک سی ہوتی ہے!!

☆......☆......☆

میرے میاں حبیب ناصر، شادی سے پہلے ہی مجھے علم ہو چکا تھا کہ عادتاً میم راشدہ سے مختلف ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں کہ میں پریشان ہوتی۔ پانچ انگلیاں برابر نہ ہونے والا محارہ ذہن میں لے آئیے لیکن مجھے یہ قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ شادی کے بعد بہت دن تک میں اس انتظار میں رہی کہ وہ مجھے مخاطب کر کے کہیں۔ ''عنزہ آج سے میری چھٹی ختم۔'' ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ آفس نہیں جائیں گے؟''

جواب میں سرخ گھورنے والی آنکھیں اور ماتھے پر لاتعداد تیوریوں نے چپ کروادیا۔ ساس سے پوچھا تو کہنے لگیں۔ ''نہیں حبیب کوئی جاب نہیں کرتا۔''

''اچھا......تو......'' اس کے بعد سارے الفاظ میرے حلق میں دم توڑ گئے۔

''تمہیں کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے کی تنگی نہیں ہوگی۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔'' انتہائی سنجیدگی سے میری ساس جنہیں میں ''امی جی'' کہتی ہوں نے کہا۔

ابھی چند دن پہلے مجھے پتہ چلا تھا کہ امی جی کی دو بہنیں ابنارمل ہیں جن کو سنبھالنے کیلیے ایک فل ٹائم اٹینڈنیٹ رکھی ہوتی ہے۔ ان بہنوں کے اور اٹینڈنیٹ کے اخراجات بھی امی جی ادا کرتی ہیں کہ ان کے والدین حیات نہیں۔ بس تین بہنیں تھیں۔ ایک یہی یعنی میری ساس اور دوسری یہ ذہنی معذور بہنیں۔ یہ بات مجھے گھر کی پرانی ملازمہ نے بتائی تھی اور سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔ ''الف سے یے تک سارا خرچہ تمہاری ساس برداشت کرتی ہیں میکے کا۔ راشن سے لے کر بجلی، پانی کے بلوں کی ادائیگی تک۔ بڑی محنت کرتی ہیں تمہاری ساس ان کو سنبھالنے میں۔''

میرے میاں میں کچھ اور باتیں بھی پراسرار سی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دل کی بات کبھی نہیں بتاتے۔ دوسرا یہ کہ بہت جلد غصّے میں آجاتے ہیں۔ شور شرابا بہت زیادہ کرتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے لاتعلق ہو جاتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود مجھے کسی قسم کی شکائت کا موقع کم ہی دیا ہے۔ کچھ چیزیں انسانی زندگی بلکہ ازدواجی زندگی میں تلخی پیدا کرتی ہیں۔ پیسے کی فرمائش، شاپنگ کے لئے بازار جانا، میاں کی پسند ناپسند کا خیال نہ کرنا لیکن ابھی ایک سالہ زندگی میں ایسی نوبت ہی نہیں آئی کہ میں یا حبیب پرکھ پاتے۔ پیسے مانگنے کی نوبت اس لئے نہیں آئی کہ جہیز لانے پر پابندی تھی پیسے پر تو نہیں۔ میرے ماں باپ نے کچھ نہ کچھ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کردی تھی۔ شاپنگ امی جی ہی کرتی ہیں۔ اختلاف کہاں پیدا ہوتا۔

آپ دعا کریں ایسے پیچیدہ مسائل میری زندگی میں آنے کا موقع نہ پاسکیں۔

☆......☆......☆

کل عنزہ اور حبیب کی شادی کو پورا ایک سال مکمل ہو چکا ہے۔ ابھی تک عنزہ میری توقعات پر الحمداللہ پوری ہی اتری ہے۔ جن جن باتوں کو مدنظر رکھ کر میں نے یہ رشتہ طے کیا تھا مجھے فخر ہے عنزہ نے بھرپور ساتھ دیا ہے۔ بس بندہ بشر ہے ناں! ازدواجی زندگی کی شروعات میں کہیں نہ کہیں اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ شوگر کی وجہ سے حبیب کی چڑچڑاہٹ زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی موذی مرض کی وجہ سے وہ کہیں ٹک کر ملازمت بھی نہیں کر پاتا۔ مجھے امید ہے عنزہ اس خبر کو بھی بحسن وخوبی سمجھ لے گی اور ضرور بالضرور تعاون ہی کرے گی۔ بارہ سالوں میں مَیں نے اسے لڑکیوں والے شوق سے بے نیاز دیکھا اسی لئے تو اسے پسند کیا۔ کپڑے لتّے، جیولری، میچنگ اور ہر بدلتے فیشن کا

بھرپور ساتھ دینے والی لڑکیاں تو میرے گھر کے مخصوص حالات میں ہفتہ بھی نہ چل پاتیں۔ ویسے یہ شوق ہرلڑکی میں ہوتا ضرور ہے۔ پسند کئے جانے کا شوق، نمایاں نظر آنے کا شوق۔ ابھی کل ہی عنزہ کہہ رہی تھی ''امی جی میرا خیال ہے عید پر ہم دونوں ایک جیسے سوٹ نہ سلوائیں۔'' میں نے بظاہر مسکرا کر ٹال دیا۔ خطرے کا الارم تو ہے لیکن اسکا حل یہی ہے کہ اسے بازار نہ جانے دیا جائے۔ سو جب تک ہمت رہی میں ہی یہ ذمہ داری آئندہ بھی نبھاؤں گی۔ اچھی بات یہ ہے کہ سال بھر میں عنزہ نے شکائت کا موقع کم ہی آنے دیا ہے۔

☆......☆......☆

''دادی! دادی جان!'' ڈیڑھ دوسالہ ثوبان دادی کی ٹانگوں سے چمٹا جارہا تھا۔

''جی میری جان۔'' دادی جی نے پیار سے اسے گود میں لیا اور توتلی زبان میں باتیں کرنے لگ گئیں۔

''ارے یہ نیپی خراب ہو رہی ہے۔''

''عنزہ، عنزہ بیٹا......'' ثوبان کی نیپی گیلی ہو رہی ہے ذرا چینج تو کرلو۔'' دادی نے آواز دی۔

''آئی امی جی، حبیب کے لئے پراٹھا بنا رہی ہوں۔'' چندمنٹ میں وہ واپس آئی تو ثوبان نے سارے کمرے میں گندگی پھیلائی ہوئی تھی۔

''اوہ میرے خدایا'' قدرے فربہی مائل جسم والی عنزہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا۔

''او گندے بچے ابھی صبح ہی تو یہ نئی چادر بچھائی ہے ساری خراب کردی۔'' اس نے جلدی جلدی بیڈشیٹ کھینچ کر اتاری ثوبان کو لے کر واش روم میں چلی گئی۔ دھونے دھلانے کپڑے صاف کرنے اور نہلانے میں بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ کمرے میں اسے لائی تو لیے سے جسم خشک کر رہی تھی جب اسے تو لیے میں سے بھی ناگوار بدبو محسوس ہوئی۔'' اُف......'' اس نے دیکھا ہی نہیں......سارے کمرے میں یہ بدبو پھیلی تھی۔ خدا جانے کب سے وہ اسطرح پھر رہا تھا۔ ہر چیز ناپاک بدبودار اور گندی۔ پہلی دفعہ......زندگی میں پہلی دفعہ اسے اپنی ساس سے شکائت پیدا ہوئی۔ شکائت دل میں رکھوں یا زبان پر لے آؤں اسکا فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک اور بدبو ہوش وحواس سے بیگانہ کرنے کچھیا حملہ آور تھی۔ کچن میں سالن بری طرح جل چکا تھا۔ پتیلی جل جل کر دھواں بن گئی تھی اور دودھ ابل کر بہتا ہوا فرش پر پھیلا پڑا تھا۔

''آتے ہوئے چولہا تو بند کر دینا تھا۔'' ذرا سے سخت لہجے میں امی جی نے کہا۔

''آپ نے زور سے آواز دی تو مجھے دھیان نہیں رہا کہ ایسا لمبا چوڑا سلسلہ ہوگا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں وضاحت کی۔

''تو دھیان رکھنا تھا......ساری مائیں ایسے ہی بچے پالتی ہیں'' ساس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''جی اچھا'' کہہ کر اس نے اپنی شکائت کا گلا دبادیا اور کچن میں چلی گئی۔ نئے سرے سے مصالحہ بھوننے اور سالن تیار کرنے میں جتنی دیر لگی اس سے زیادہ دیر اُسے اپنے آپ کو سیٹ کرنے میں لگی۔

''کیا تھا جو امی پمپر لے دیں اور نیپی آج کے زمانے میں کون استعمال کرتا ہے؟ کیا پیسے اسلئے کمائے جاتے ہیں کہ ضرورت کے لئے بھی بندہ مٹھی نہ کھولے۔ ان تین سالوں میں جو کپڑا لائیں میں نے پہن لیا جو دال سبزی دی پکالی۔ لیکن بچے کی ضرورتیں کون پوری کرے۔ حبیب تو شوگر کی وجہ سے ویسے ہی دودن لگ کر ایک کام نہیں کرتے۔ چار روپے لینے ہوں ماں کے آگے ہاتھ پھیلاتے

ہیں۔ میں بچے کی دوسری ضرورتوں کے لیے کس سے کہوں؟ یہ کیسی زندگی ہے! کسی کا رویہ دکھ نہیں دیتا بس طور طریقے دکھ دیتے ہیں۔

عنزہ چپ چاپ روتی رہی۔اس کے بن بہائے آنسو اسکے دل پر گرتے رہے۔ وہ صاف شفاف دل جس کو امی ساس کے دل کی تنگی نے میلا اور گدلا گدلا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

کل بہت عجیب بات ہوئی۔ نزلے ،فلو کی وجہ سے میرا ناک کافی دنوں سے بند تھا۔ثوبان کے اٹھنے کا ٹائم تھا۔ عنزہ اس وقت بہت مصروف رہتی ہے۔ناصر کے لیے جوس، میرے لیے سادہ روٹی چاہئے ،سالن،حبیب کے لئے آملیٹ پراٹھا......فیڈر دھونے، بنانے کا کام......سبزی والا س وقت سبزی لاتا ہے، دودھ والے کو بھی اسی وقت دودھ لے کر آنا ہوتا ہے۔ بیچاری بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوجاتی ہے میری کوشش ہوتی ہے کہ کم ازکم ثوبان کو گود لے لیا کروں۔ وہ ہے بھی روندو بچہ......ماں کو دیکھتے ہی اسکا باجا شروع ہوجاتا ہے۔میں عنزہ کے کمرے میں آئی تو وہ کروٹ لے رہا تھا۔موڈ اچھا تھا۔دادی جی......دادی جی کے نعروں کے ساتھ وہ میری طرف لپکا۔ میں نے اسے گود میں لیا۔ جونہی اس نے میرے گلے میں اپنے بازو ڈالے مجھے وہ گیلا گیلا محسوس ہوا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ کام خراب نہ کردے۔ میں نے عنزہ کو آواز دی۔ وہ بیچاری کچن سے بھاگی آئی تو سارا گھر گندہ ہوچکا تھا۔ اس بیچاری کو بہت جھکا پڑا۔ مجھے الگ شرمندگی ہورہی تھی وہ کیا سوچ رہی ہوگی شاید میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ دبے دبے لفظوں میں اس نے پیمپرز وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے لیکن میں کیا کروں۔ میرے دل میں ہزار بار خواہش پیدا ہوتی ہے کہ دنیا کی ہر سہولت ان دونوں کو دوں لیکن میری مجبوریاں!!

کاش میں عنزہ کو بتا سکوں۔اُسے دل کے زخم ادھیڑ کر دکھاؤں۔اعلیٰ خاندان سے تعلق سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے پر کیا دکھ بیتے۔ ماں باپ کے اچانک انتقال نے اس کی ازدواجی زندگی کو کس قدر دھچکے لگائے۔ دو معذور بہنوں کی ذمہ داری کا فرض......مجبوریاں......کاش میں اسے بتا سکوں کہ عنزہ تمہاری ساس دل کی تنگ نہیں ہے۔ بے روزگار بیٹے کی اسکی بیوی بچے کی ذمہ داری، اپنی معذور بہنوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ناتواں کندھوں پر اٹھاتے اٹھاتے زندگی کتنی سنگلاخ اور کھردری ہوچکی ہے۔ میاں کے اس معاہدے سے کہ اگر تم اپنی معذور بہنوں کا تمام خرچ اٹھاؤ گی تو میں بھی اپنی کمائی اپنے بھانجوں،بھتیجوں پر لٹاؤں گا۔ میں کس قدر تہی دامن ہوں......کاش عنزہ میں تمہیں پاس بٹھا کر سب بتا سکوں!

☆......☆......☆

ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی کتنی بے رونق ہوجاتی ہے ہر روز صبح شام ایک جیسی،تھکا دینے والی، بے کیف بن جاتی ہے۔جیسے ہی چکی کا پہیہ گھومتے گھومتے ایکدم رُک جائے۔

حمنہ اور یمنیٰ دونوں معذور بہنوں کے بگڑے ٹائیفائیڈ کے علاج میں بہت رقم لگی۔ پھر حج کا فرض باقی تھا۔اسکی ادائیگی میں یک مشت لاکھوں لگ گئے۔ واپس آئی تو صحیح معنوں میں آٹے دال کا بھاؤ پتہ چلا ہے۔ادھر سے پنشن کی رقم ہاتھ آتی ہے ادھر سے اُڑ جاتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے عنزہ سے کہوں، بیٹا ثوبان کو میں خود سنبھالوں گی تم ہی کہیں جاب کرلو۔لیکن یہ بھی ممکن نہیں۔کل پرسوں سے مجھے وہ کچھ زرد زرد سی دکھائی دے رہی ہے......الٹی متلی سے بدحال۔ اسکا مطلب ہے ایک جان اور رزق میں حصّے بٹانے

آ رہی ہے!

☆......☆......☆

عید پر ثوبان کو کچھ عیدی ملی۔ بے بی سائیکل، اپنے لئے بڑے شیمپو کی بوتل چند ایک ضروری اشیاء خریدنے والی تھیں۔ ہمت کر کے وہ سب کی سب خرید ہی لیں۔ امی کو میں نے نہیں بتایا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بہت پریشان رہتی ہیں۔ ہر وقت کی ٹینشن سے مجھے تو لگتا ہے ان کا بی پی ہی شوٹ نہ کر جائے۔ بس ہر وقت کی فکر میں ہلکان رہتی ہیں کہ کدھر سے اور کیسے رقم بچائی جاسکتی ہے۔ حبیب کی بڑھتی بیماری، تیزی سے کم ہوتا وزن انہیں مزید پریشان کرتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوتی ہوں اپنی ملازمت کے دوران خوش مزاج، خوش گفتار میم راشدہ کے مسائل کیا شروع سے اتنے سنگین تھے؟

میرے سسر صرف اور صرف اپنی ذات میں مگن رہنے والے انسان ہیں۔ سنا ہے وہ اس شادی (اپنی) پر راضی نہیں تھے جبری شادی کا بدلہ انہوں نے بیوی اور بچے سے لاتعلقی کا اظہار کر کے دیا۔ اپنی آمدنی بھانجوں، بھتیجوں کے شاندار کیریئر میں خرچ کرتے ہوئے انہیں کبھی اپنا بیٹا دکھائی نہیں دیتا؟

میں نے اب سوچ لیا ہے ٹیوشنز کر کے کچھ نہ کچھ آمدنی کی صورت پیدا کروں، ثوبان کی ضرورتیں بھی تو آئے دن بڑی ہوتی جارہی ہیں۔

☆......☆......☆

نہانے گھسیا واش روم میں قدم رکھا تو یاد آیا کہ پہلے والا شیمپو ختم تھا اور ثوبان کی عیدی سے لیا گیا شیمپو ابھی شاپنگ بیگ میں ہی پڑا ہے۔ اس نے شیمپو سامان سے لیا۔ دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ایک دفعہ ہی کنگ سائز بوتل لینے سے اب چار چھ ماہ آسانی سے گزر جائیں گے۔ نہا دھو کر بال بنائے، دل ودماغ اور بھی منصوبے بناتے جارہے تھے۔ ایک دو ٹیوشنز، ایک آدھ پرائیویٹ کالج میں وزیٹنگ لیکچرز سے زندگی اتنی آسان ہوجائے گی کہ بنیادی ضرورتوں کے لئے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ ویسے کتنی حیران کن بات ہے کل پہلی دفعہ سسر نے اسکے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ رکھا تھا۔ بیٹے اس سے پسند کی چیز لے لینا۔ چلو پتھر میں سوراخ تو ہوا۔ اللہ سب کی مشکلیں آسان کرے۔ مہنگائی آسمانوں سے باتیں کررہی ہے۔ یوٹیلیٹی بلز آدھی سے زیادہ پنشن کھا جاتے ہیں۔ امی جی بھی کیا کریں؟

بال بنا کر اس نے ظہر کی نماز ادا کی۔ کھانا لگایا اور واش روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے یاد آیا کہ شیمپو تو نیچے ہی پڑا ہے، اوپر رکھ دوں کہیں ثوبان نہ پہنچ کر گرادے۔

شیمپو کی بوتل ہاتھ میں لے کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

چند منٹ پہلے ابھی ابھی یہ بوتل ہاتھ میں لی تھی تو اسکا وزن اتنا ہلکا ہلکا نہیں تھا۔ اسی شش و پنج میں وہ ساس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

وہی جانی پہچانی سی خوشبو اس کی ناک تک پہنچی۔ پہچاننے میں ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصّہ بھی صرف نہ ہوا۔

''ارے یہ تو میرے شیمپو کی خوشبو ہے۔'' اس نے ناک کی سیدھ میں خوشبو کا سراغ لگایا۔

ٹی وی ٹرالی میں ٹی وی کے پیچھے پرانے شیمپو کی بوتل پڑی تھی اور بوتل کے ڈھکن پر یہی شیمپو بہہ رہا تھا۔ عنزہ کے دل میں برچھی سی لگی۔!!

گھر میں امی جی اور اس کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہ تھا۔ اپنے شیمپو کی بوتل کا وزن کم ہونے کی وجہ تو سمجھ میں

آ گئی لیکن بہت دیر تک دل و دماغ سکتے کی سی حالت میں رہے۔

شام گئے تک وہ گم سم ہی رہی۔ اسکا مطلب ہے وہ چھوٹی موٹی اشیاء جو اسکے ہینڈ بیگ سے گم ہوتی رہی ہیں۔ وہ بھی یقیناً ادھر ادھر موجود ہوں گی۔

صدمے کی شدت نے کئی دن اسکے دماغ کو سوچنے سمجھنے سے ماؤف کئے رکھا۔ گھر والوں کی باتوں کا جواب وہ بس ہوں ہاں میں دیتی۔ اسکے دماغ میں ماضی میں بہت سے بنے ہوئے بت پاش پاش ہو چکے تھے۔ ابھی بہت سے مرحلوں سے گزر کر اسے حوصلہ جمع کر کے زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا تھا۔

لیکن ابھی نہیں......ابھی تو بالکل نہیں!

☆......☆......☆

مہنگائی اور بیٹے کی بے روزگاری نے مجھے اس آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ ہنسنا بھول گئی ہوں۔ میرے پرس میں مہینے کی چودہ تاریخ کو پنشن کی رقم ختم تھی۔ پورے سترہ دن ...... اللہ! کیسے گزریں گے۔

عنزہ میکے سے ہو کر آئی تھی۔ اسکی باتوں سے بھی پتہ چلا کہ اس کے بھائی کو عرب امارات میں اچھی ملازمت مل گئی ہے اور ثوبان کو ٹھیک ٹھاک رقم عیدی میں ملی ہے۔ میں نے اضطراری حالت میں ایک نوٹ صرف پانچ سو کا لیا ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ جونہی مجھے کسی پرائیویٹ سیکٹر میں جاب ملی تو میں یہ رقم لوٹا دوں گی۔

ویسے میں نے غلطی کی، مجھے عنزہ کو بتا دینا چاہیے تھا۔ شک کی دراڑ کہیں بہت بڑا زلزلہ آنے کا باعث نہ بن جائے۔

عنزہ میں بہت شرمندہ ہوں اور ایک حرکت تو اس سے بھی بڑی غلط ہوگئی۔ اُف میرے خدایا۔ واش روم میں شیمپو کی بڑی بوتل تھی۔ میں نے بہت دنوں سے بازار جانے کا یعنی ضرورت کی اشیاء لانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ میں نے ایسے ہی شیمپو تھوڑا سا لینا چاہا مجھے اندازہ نہیں تھا بوتل میں شیمپو جما ہونے کی بجائے لیکوئڈ ہوگا۔ شیمپو جھل جھل کرتا بہتا سیکنڈ میں خالی ہوگیا۔

اُف میرے خدایا اوپر سے عنزہ پہنچ گئی۔ میں تو شیمپو کی بوتل جلدی سے ٹی وی ٹرالی میں چھپا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن کتنا برا ہوا! عنزہ کیا سوچے گی۔؟ اُف میں نے کیا کیا۔؟

☆......☆......☆

''عنزہ بیٹے۔'' میں نے اسکے سامنے تازہ تازہ ٹھنڈے آلو بخارے رکھے۔ آلو بخارے اسے بہت پسند ہیں۔ شیمپو کی بوتل تنخواہ ملتے ہی خرید کر میں نے اسکے بیڈروم میں رکھ دی تھی۔ پانچ سو کا نوٹ بھی اسکے پرس میں ڈال دیا۔

عنزہ نے پلکیں اٹھائیں۔ آنسوؤں سے بھیگی پلکیں۔

''جی۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''بیٹے میں نے سر مشتاق سے بات کی ہے۔'' جان بوجھ کر میں نے بات روکی۔ اسکا ردعمل دیکھنے کچھیا۔ اسکا چہرہ ابھی بھی سپاٹ تھا۔ ''سر مشتاق سے میں نے کنٹریکٹ کیا ہے۔ بلڈنگ ان کی ہوگی۔ اخراجات ان کے، میں، تم اور حبیب ایک ایک سبجیکٹ کی ٹیوشنز دیں گے ان کی اکیڈمی میں۔ انہوں نے بہت پر کشش معاوضے کی پیشکش کی ہے۔''

عنزہ بدستور خاموش رہی۔

''عنزہ بیٹا۔ مجھے پتہ ہے تم خفا ہو۔ تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی ہے۔ آئیڈیلزم کے چکروں میں جو پڑ جائے وہ

ہمیشہ یہی دکھ اٹھاتا ہے۔'' میں نے اسکے ٹھنڈے یخ ہاتھ تھامے۔''میں میم راشدہ نہیں۔ گوشت پوست کی بنی انسان ہوں۔ بلکہ پوری کائنات میں جہاں بھی تم جاؤ گی، جس ہستی کو بھی تم آئیڈیل بناؤ گی، تمہارا آئیڈیل تمہیں جینے نہیں دے گا۔ سب انسان خاکی ہیں۔ خطا کے پتلے......سیاہ کار...... چھوٹی بڑی غلطیاں کرنے والے۔ پاک، مکمل، بے عیب اور آئیڈیل ہستی ایک ہی ہے......میرے آقائے نامدار کی!''
میری آنکھوں سے جھل جھل آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسکے ہاتھ مضبوطی سے تھامے۔''مجھے معاف کردو۔''

عنزہ تڑپ اٹھی۔''امی جی کیا کررہی ہیں؟ میں کب خفا ہوں آپ سے؟ میں تو احسان مند ہوں آپ کی۔ اگر یہ سب نہ ہوتا تو میں اصل آئیڈیل تک پہنچ ہی نہ پاتی اور یونہی دھکے کھاتی دنیا کے آئیڈیلوں کے پیچھے دوڑتی زندگی گزار کر ناکامیوں کا منہ دیکھتی۔'' وہ دیوانہ وار میرے ہاتھ چوم رہی تھی۔''اصل آئیڈیل کا رستہ تو آپ نے دکھایا ہے مجھے۔ سارے پردے تو اب چاک ہوئے ہیں غفلتیں تو اب دُھلی ہیں...... روشنی تو اب میرے دل میں ہوئی ہے...... سدا جگمگانے کے لئے!!''

☆☆☆

# شاہ جی

ہم اپنے والد کو ابی جان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ دنیاوی لحاظ سے وہ بہت عالم فاضل تو نہ تھے لیکن علم دوست تھے۔ ان کی اردو اور انگریزی کی تحریر میں بہت سادگی، روانی اور ادب کی چاشنی ہوتی تھی۔ جب کبھی وہ اپنی نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں چند روزہ قیام کیا کرتے تو اس دوران ہمیں باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے۔

اس زمانے میں ٹیلی فون عام نہیں تھے۔ ہم سب بہن بھائی انکے خطوط کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ ان خطوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ جس کو بھی خط لکھتے، اسکی عمر کے مطابق لکھتے تھے۔ یہ خط اتنے دلچسپ ہوتے تھے کہ ہم داستانِ امیر حمزہ کو بھول جاتے، ان میں پرانے سبق آموز قصے دہرائے جاتے، واقعات کی کڑیاں یوں ملتی چلی جاتیں کہ ہم کھو جاتے، کہیں شعروں کے حوالے دیئے جاتے، کہیں اقوال زریں رقم کئے جاتے، کہیں شگفتہ مزاح سے رنگ بھرا جاتا تو کہیں دلچسپ مثالیں دے دے کر بات کو واضح کیا جاتا۔ غرض یہ کہ نہ صرف ہم ان خطوں سے لطف اندوز ہوتے بلکہ ہمارے کئی دوست احباب بھی ان کے منتظر رہتے۔ ان میں سے کچھ خط آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔ کبھی کبھار میں ان کو پڑھ کر مزے لیتی ہوں لیکن اب اس مزے میں درد کی کیفیت بھی شامل ہوگئی ہے کیونکہ لکھنے والا اب بہت دور چلا گیا ہے اور میرے لئے ایسے پرلطف خطوط کا مزید انتظار لاحاصل ہوکر رہ گیا ہے۔ دراصل انتظار کے دامن میں امید بندھی ہوتی ہے۔ انتظار ختم ہوجائے تو امید بھی دم توڑ دیتی ہے۔ کسی انسان کا رابطہ جب انتظار اور امید سے منقطع ہوجاتا ہے تو پھر اس کی جھولی اداسی سے بھر جاتی ہے۔

ابی جان ہماری پڑھائی میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو وہ ہمیں بچوں کے مختلف رسالوں میں سے کہانیاں، نظمیں اور لطائف پڑھ کر سناتے۔ پھر جب ہم نے ان سے پڑھنا سیکھ لیا تو وہ بصد شوق ہم سے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ روزانہ ہمیں ہوم ورک بھی وہی کروایا کرتے تھے۔ روپے پیسے اور جائیداد سے انہیں کوئی شغف نہ تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور اللہ نے انکو جو دے رکھا تھا وہ اسی پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ وہ اچھی کتابیں پڑھنے کے ازحد شوقین تھے اور انہیں اس بات کا بہت ارمان تھا کہ ہم سب بہن بھائی خوب پڑھ لکھ جائیں۔ کبھی کبھار وہ ہم بہن بھائیوں کو کوئی عنوان تجویز کر کے ہمیں کچھ وقت دے کر کہتے کہ اسکے تحت لکھ کر دکھاؤ۔ وہ ہماری تحریروں کو بہت شوق سے پڑھتے اور پھر فرداً فرداً ان پر تنقید بھی کرتے اور تعریف بھی۔

میری کچھ تحریریں ان کی نظر سے گزریں تو میرے بارے میں انہیں یہ خوش فہمی ہوگئی کہ مناسب رہنمائی اور مشق کے بعد شاید میں بہتر انداز میں لکھنے کے قابل ہوسکتی ہوں۔ میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی جب میں نے کشمیر کی بیٹی کے عنوان سے ایک کہانی لکھی۔ ابی جان کو وہ کہانی بہت پسند آئی وہ خوشی خوشی میری اس تحریر کو اپنے ایک لکھاری دوست کے پاس لے گئے اور

ان سے کہا کہ وہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دیں۔

شاہ جی نے تنقیدی نظروں سے تحریر کو پڑھا اور پھر مایوسی سے اپنا سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہنے لگے۔

''کبھی نہیں، ہرگز نہیں، یہ بچی تو لکھنے کے فن سے نابلد ہے۔ لفظوں کا چناؤ غلط، ترتیب غلط، تراکیب غلط، زبان غلط، گریمر غلط، روانی مفقود ہے، دلچسپی کا کوئی عنصر نہیں، واقعات میں ہم آہنگی نہیں، کہانی کی ابتداء بہت بوجھل محسوس ہوتی ہے اور کہانی کے اختتام پر اپنے وقت کے زیاں کا احساس ستانے لگتا ہے۔ اجی! لکھنا لکھانا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں، اسکے لئے گہر مطالعہ چاہیے۔ اپنے آس پاس کا عمیق مشاہدہ چاہیے، دیکھنے والی آنکھ چاہیے، سوچنے والا دماغ چاہیے، حساس دل چاہیے وغیرہ وغیرہ''

شاہ جی کا سیر حاصل تبصرہ سن کر ابی جان مایوس ہو گئے۔ وہ تو انکے پاس اس لئے گئے تھے کہ میری تحریر پڑھ کر انکے ذہن میں جو شک ابھر آیا تھا شاہ جی اسکی تائید کر دیں اور پھر ان کا یہ شک یقین میں بدل جائے لیکن خلافِ توقع شاہ جی نے پر یقین لہجے کے ساتھ ان کا یہ شبہ ہی دور کر دیا اور اس شک کے جاتے ہی انکی وہ چھوٹی سی خوشی بھی روٹھ کر چلی گئی جو اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں در آئی تھی۔ وہ شکستہ دل واپس لوٹے۔ انہوں نے مجھے شاہ جی کے ارشادات کی تفاصیل سے آگاہ نہیں کیا۔ جب میں نے پوچھا تو کہنے لگے ''شاہ جی تمہاری تحریر سے بہت خوش نہیں ہوئے شاید اس لئے کہ وہ ادب کی بہت بلند سطح پر براجمان ہیں اور جو شخص بہت اونچے مقام پر ہو اسے نچلی سطح کی چیزیں چھوٹی چھوٹی دکھائی دیتی ہیں اور حقیر بھی۔ لیکن تمہیں دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم بہر حال لکھتی رہو کہ اگر مشق جاری رہے تو وقت کے ساتھ ساتھ تحریر میں نکھار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔''

اس وقت اگر چہ میں چھوٹی تھی لیکن ابی جان کے لب و لہجے سے مجھے شاہ جی کی رائے کے بارے میں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ابی جان دکھی دل سے بھائیجان کو شاہ جی کی گفتگو سے آگاہ کر رہے تھے کہ میں نے بھی سن لیا۔ یہ سنکر میں نے شاہ جی کی رائے سے اس لئے اتفاق کر لیا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کا فرمان بجا تھا اور ان کی رائے مستند تھی۔ اگر کوئی عام آدمی یہ بات کرتا تو شاید وہ میرے لئے درخور اعتنا نہ ہوتی لیکن یہ تو ایک عالم کی رائے تھی اور اس رائے کے پس منظر میں انکی ذہانت، انکی عقل، انکا علم اور انکا تجربہ تھا۔ پھر بھلا ان کی بات کیونکر جھٹلائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب کچھ نہ لکھوں گی۔ خواہ مخواہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ ابی جان کے دل میں جھوٹی امید کا دیا جلانے سے کیا فائدہ؟

چنانچہ میں نے لکھنے لکھانے کا شغل ترک کر دیا۔ اسکول میں جب کبھی ہماری اردو کی معلّمہ کوئی مضمون لکھنے کو دیتیں تو میں اسے بے دلی سے لکھ دیتی۔ کبھی کبھار میری ٹیچر کسی مضمون سے خوش ہو کر کچھ تعریفی جملے کہہ دیتیں لیکن اب مجھے انکے ان جملوں سے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ میں سوچتی تھی مانا کہ میری ٹیچر بہت قابل ہیں لیکن ان کا مقام اور مرتبہ شاہ جی جیسا تو نہیں جب مجھے وہاں سے سند نہیں مل سکی تو اس تعریف کی کیا وقعت ہے۔ اب بھلا میں اتنی بچی بھی نہیں کہ ایسے کلمات سے بہل جاؤں گی۔

وقت گزرتا رہا۔ میں نے بی اے کر لیا۔ میری شادی ہو گئی۔ پھر میں اپنے گھر اور بال بچوں میں ایسی مگن ہو گئی کہ شاہ جی کو بھی بھول گئی اور انکی باتوں کو بھی، جب میری دونوں بیٹیاں بیاہ کر کنیڈا چلی گئیں اور مجھے قدرے فراغت ملی تو میں نے

قرآن کلاس میں داخلہ لے لیا۔اس کلاس کے اختتام پر ہماری اساتذہ نے ہم سے کہا کہ ہم قرآن کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات لکھ کر لائیں۔

اتنے عرصے کے بعد مجھے شاہ جی پھر یاد آ گئے۔اب میری آنکھوں کے سامنے یکساں بلند مقام پر دو بزرگ ہستیاں صف آراء ہوگئیں۔ایک طرف میری اساتذہ تھیں جو کہہ رہی تھیں کہ۔''لکھو۔لکھتی کیوں نہیں؟'' دوسری طرف شاہ جی تھے جو کہتے تھے''خبردار! جوایک لفظ بھی لکھا۔میرے ہوتے ہوئے تم ادب کی بے ادبی نہیں کرسکتیں۔میں یہ توہین ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔''

بارہا میں نے شاہ جی کی دھمکی کو نظرانداز کرتے ہوئے لکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی کیونکہ جونہی میں لکھنے کچھیا بیٹھتی،شاہ جی میرے سامنے آکر کرسی پر براجمان ہوجاتے۔ان کے ماتھے پر تیوری ہوتی،ان کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہوتے منہ غصے سے لال ہوتا اور وہ مجھے گھور رہے ہوتے تھے۔پھر انکی پاٹ دار آواز میرے کانوں میں آنے لگتی ''کبھی نہیں ،ہرگز نہیں۔یہ بچی تو لکھنے کے فن سے نابلد ہے۔لفظوں کا چناؤ غلط، ترتیب غلط، تراکیب غلط،زبان غلط،گریمر غلط،روانی مفقود، دلچسپی کا کوئی عنصر نہیں،واقعات میں ہم آہنگی نہیں۔کہانی کی ابتداء بہت بوجھل محسوس ہوتی ہے اور کہانی کے اختتام پر وقت کے زیاں کا احساس ستانے لگتا ہے۔''

یہ خیال آتے ہی میں کاغذ قلم ایک طرف رکھ کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہوجاتی اور اپنے آپ کو سمجھاتی کہ مجھے لکھنے کی خواہش کو ہمیشہ کچھیا خیرباد کہہ دینا چاہیے کیونکہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔لیکن میری اساتذہ کا اصرار جاری رہا۔یہاں تک کہ مجھے اپنے انکار پر قائم رہنا مشکل نظر آنے لگا۔اپنے آپکو بے بس پا کر میں نے اللہ کے دربار میں فریاد کرنا شروع کردی۔میں نے اپنے رب رحیم سے کہا''دیکھ میرے اچھے اللہ میاں! مانا کہ شاہ جی بڑے آدمی ہیں لیکن تو تو اس سے بہت بڑا ہے۔بہت بلند وبالا اور حاکم اعلیٰ۔اب صورتحال یہ ہے کہ میں لکھنا چاہتی ہوں لیکن شاہ جی اس پر رضامند نہیں ہوتے اور وہ مجھے لکھنے نہیں دیتے۔میں اپنے اندر ان کے مقابلے کی تاب نہیں پاتی کیونکہ کہاں پدی اور کہاں پدی کا شوربہ۔تو میری مدد اور رہنمائی کر،تو میرا ہاتھ تھام لے،تو ہی شاہ جی کو سمجھا دے۔میری بات تو وہ مانتے نہیں لیکن تیرے حکم کو وہ ٹال نہیں سکتے۔اس لئے پلیز میرے اچھے اللہ میاں۔''

اس کے بعد اللہ کا نام لے کر لکھنے کچھیا بیٹھ گئی۔مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ میرے سامنے والی کرسی خالی تھی۔اس پر شاہ جی رونق افروز نہیں تھے۔ان کی آواز بھی میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔چند لمحوں کے بعد اس کرسی پر ابی جان آکر بیٹھ گئے۔وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ان کی آنکھوں سے محبت چھلک رہی تھی۔پھر انہوں نے اپنے مخصوص انداز اور پرجوش لہجے میں مجھ سے کہا''کیوں بھئی! کیا ماجرا ہے؟ کس سوچ میں گم ہو؟ گھبراتی کیوں ہو؟ بسم اللہ کرو۔لکھنا شروع کرو اور لکھتی چلی جاؤ۔''

ابی جان کی حوصلہ افزائی پا کر میں نے لکھنا شروع کیا اور بآسانی اپنے تاثرات لکھ ڈالے۔

اب جب بھی میں لکھنے کچھیا بیٹھتی ہوں تو ابی جان میرے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں اور شفقت آمیز لہجے میں مجھ سے کہتے ہیں

''کیوں بھئی! کس سوچ میں گم ہو؟ گھبراتی کیوں ہو؟ بسم اللہ کرو۔لکھنا شروع کرو اور لکھتی چلی جاؤ۔''

چنانچہ اب میں ابی جان کے لئے بھی لکھتی ہوں کہ انکی خواہش تھی۔اپنے لئے بھی لکھتی ہوں کہ اپنے خیالات کو الفاظ کا

جامہ پہنا کر مجھے انجانی سی خوشی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے قارئین کچھیا بھی لکھتی ہوں کہ شاید وہ بھی میری اس خوشی میں شریک ہو کر سرشار ہوسکیں۔ لیکن کبھی کبھار مجھے یہ خوف گھیر لیتا ہے کہ میری کوئی تحریر کوئی شاہ جی نہ پڑھ لیں۔ میں اپنے قارئین کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اگر وہ شاہ جی کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں تو یقیناً وہ ادب کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں اور میں ان کو احترام کے ساتھ رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہوں لیکن اگر وہ شاہ جی کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں تو پھر ان کو بلند مقام پانے کچھیا بہت جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔

☆☆☆

تسنیم کوثر

# سرِ راہ

دعامیں شدت، دل میں چُبھن ہو، من میں لگن ہوتو بہت سی مرادیں خودبخود لبوں سے جھانکنے لگتی ہیں...... اس کا قصہ جو راہ گم کر بیٹھی تھی

عورتوں کی ایک لمبی قطار...... رینگتی ہوئی ریلنگ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اگلی خواتین سرکتیں تو پیچھے والی عورتیں ان کی جگہ لے لیتیں۔ نگران خواتین ہاتھوں میں چھڑی پکڑے عورتوں کو آگے چلنے کا اشارہ کررہ تھیں...... اگرکوئی دل گرفتہ عورت...... لمحہ بھرکو آستانے کی کھڑکی سے چہرٹکائے...... دل کے بھید کھولنے کی کوشش کرتی تو نگران عورت کی کڑک دار آواز اسکے خیالات کو منتشر کردیتی اور وہ گھبرا کر وہاں سے ہٹ جاتی۔ میں بھی اس طویل قطار کا حصہ تھی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ کبھی کبھار میں اٹھتی ہوئی نگاہ اپنے دائیں بائیں ڈال لیتی۔ دائیں طرف وہ دیوار تھی جس کیساتھ رینگتے ہوئے ہمارا سفر جاری تھا اور بائیں طرف عورتوں کے جم غفیر...... طویل برآمدے میں عورتیں...... کچھ تنہا تنہا اداس سی...... کچھ بچوں کو گود میں سمیٹے ہوئے اور کچھ بہت سے عزیز رشتہ دار خواتین کے ساتھ ایک ٹولی کی شکل میں یہاں موجود تھیں۔

کوئی یٰسین شریف پڑھ رہی تھی۔ کوئی مرادیں مانگتے ہوئے، دل کے بھید کھولتے ہوئے اشکوں نذرانے پیش کررہی تھی۔

اورکوئی بانٹے جانے والے تبرک کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے تک رہی تھی۔ تبرک بانٹا جاتا تو ان عورتوں کی چھینا جھپٹی کا منظر ان کے اندر لالچ اور بھوک کو ظاہر کرتا۔ یہ عورتیں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لڑنے مرنے کو تیار تھیں مگر اس موقع پر لاٹھی بردار خواتین کی مداخلت اس خانہ جنگی کو ختم کرانے میں بھرپور کردارادا کررہی تھی، میں اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے...... سرکتے سرکتے اب اس کھڑکی تک آ پہنچی تھی، جو زنان خانے کی طرف واتھی۔ اس دریچے کے ساتھ بندھے ہوئے مرادوں کے بہت سے تالے اور بے شمار رنگا رنگ منتوں کے دھاگے میری آنکھوں کے سامنے تھے۔

''گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا، ناقصاں راپیر کامل، کاملاں رارہنما'' میں اللہ والے کی اس چوکھٹ سے لگی کھڑی تھی جس کی تعلیمات کا فیض ہر خاص وعام کے لئے جاری تھا۔ گلاب کے پھولوں کی مسحور کن خوشبوفضا کو معطر کیے ہوئے تھی۔ پھولوں اور سبز چادروں کے انبار تلے ''داتا'' کا مرقد، میری اداس پتلیوں میں جم گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں الجھی ہوئی تھی۔ دعا میں شدت، دل میں چبھن ہو، من میں لگن ہوتو بہت سی مرادیں خودبخود لبوں سے جھانکنے لگتی ہیں، میں اپنے من کو ٹٹولتی ہوئی...... اپنی تشنہ کامیوں پہ پلکیں بھگوتی ہوئی...... بے اختیاری کو اپنے اختیار میں لانے کو تھی۔ نا جانے وہاں کیا سوچتی رہی کہ منتظم خاتون کی گرجدار آواز نے میری سوچوں کو اتھل پتھل کردیا ''جلدی کرو بی بی! دوسری عورتوں کو بھی موقع دو۔''

بھیگی آنکھیں اور خشک لب لیے میں وہاں سے ہٹی اور آگے جا کر بائیں طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

برسوں سے یہ میری عادت تھی...... جب حالات سے جی اوب جاتا۔ دل رہنمائی سے انکار کردیتا...... ماحول کا کھچاؤ اور الجھنوں کا تناؤ جب من کے رچاؤ سے میل نہ کھاتا تب میں یہاں چلی آتی تھی......اللہ کے آگے اشک بہا کر جی ہلکا ہوجاتا تھا، بے چین طبیعت کو قرار آجاتا تھا یہاں آکر لوگوں کو دیکھتی تو احساس ہوتا کہ پریشانیاں تو زندگی کے ساتھ جڑی ہیں جیسے آسمان کے ساتھ تارے......آسمان کے ستارے روشنی دیتے ہیں جب کہ پریشانیاں...... پشیمانی کے قطروں میں ڈھل کر ماتھے پہ چمکنے لگتی ہیں، اشکوں کی صورت گالوں پر ڈھلکنے لگتی ہیں۔

مسجد میں نفل پڑھ کر میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ اپنے قریب......تیز سسکیوں نے مجھے چونکا دیا......میرا ذہن منتشر ہوگیا۔ میری دعائیں سسکیوں کی تیز آندھی میں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ڈولنے لگیں۔ میں اپنے دل کا کون سا دکھ بیان کرنے کو تھی، کیا مانگ رہی تھی......سب کچھ بھول گئی، دعا کے لئے میرے ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ میں نے دیکھا ایک بے حد خوش شکل لڑکی ایک ہاتھ میں پنجسورہ لیے دوسرے ہاتھ سے ماتھا پکڑے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ میں دکھی ہوئی میں تو پہلے ہی دکھی تھی، اس لڑکی کے آنسوؤں نے میرے تن من کو دکھوں کی بارش سے بھگو دیا۔ یہاں تو آنسو ہی آنسو تھے۔ سسکیاں تھیں، آہیں تھیں ہم لوگوں سے اپنا دکھ چھپاتے ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے راز اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ کے در پہ آکر ہم سارے بھید کھول دیتے ہیں۔ بلا جھجک یہاں سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ اپنے سارے زخم دکھا دیتے ہیں یہاں ہمیں کسی رشتے دار، کسی ہمسائے کا خوف نہیں ہوتا۔ یہاں کوئی ہمیں طعنے نہیں دیتا۔ کوئی باتیں نہیں بناتا۔ یہاں تو سب کے راز......راز ہی رکھے جاتے ہیں۔

میں نے اپنا ہاتھ اس لڑکی کے کاندھے پر رکھا۔ میرے ہاتھ کے لمس نے اس کی ہچکیوں کو اور تیز کردیا۔ ہولے سے میں نے کندھے کو دبایا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہائے سرخ انگارہ سی آنکھیں، اس کے چہرے پر سرخ قمقموں کی مانند جگمگا رہی تھیں۔ اس کی ستواں ناک میں ہیرے کی لونگ کی چمک ان آنکھوں کو اور بھی چمکدار بنا رہی تھی۔ میں نے اپنے تھرماس سے پیپر گلاس میں پانی ڈالا اور اسے تھما دیا۔

ہم دونوں چپ تھیں۔

ہم دونوں رو رہی تھیں۔

ہمارے دکھ شاید الگ الگ تھے مگر...... ہمارے آنسوؤں کی نمی ایک جیسی تھی۔

وہ پانی پی چکی تو میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک درجن کے قریب موٹی موٹی چوڑیوں سے بھرا اس کا نازک سا ہاتھ مجھے بہت وزنی لگا۔ اسکے زیورات، اس کا لباس، اس کا رکھ رکھاؤ کسی اچھے گھر کی گواہی دے رہا تھا۔ یقیناً وہ شادی شدہ تھی۔

کیوں رو رہی ہو؟ میں نے اپنائیت سے سوال کیا۔

اس کے تھمے ہوئے آنسوؤں میں پھر روانی آگئی۔ سرخ متورم انگارہ آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ پھر دھیرے سے بولی۔ میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ میں نے کہا۔

ہاں مگر میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ اس کے لہجے میں درشتگی بھی تھی اور پختگی بھی۔

سنو! میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ نہ کوئی سوال

کروں گی۔ نہ تمہاری کہانی سنوں گی۔ کیوں کہ ہم عورتوں کے دکھ سانجھے ہوتے ہیں۔ ہم سب کی کہانیاں بھی ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ کہیں سسرال کے ستم تو کہیں شوہر کی بے وفائی......کہیں بچوں کی نافرمانی تو کہیں بچوں سے محرومی، کہیں اپنوں کے دکھ کہیں غیروں کے زخم، ہمارے دکھوں کے تانے بانے انہی سے بنتے ہیں۔ یقیناً تمہای چوٹ گہری ہے اور زخم بھی تازہ۔ مگر میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تمہیں گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کوئی ایسا فیصلہ مت کرنا، جس کے لئے تمہیں عمر بھر پچھتانا پڑے۔ میں نے اس کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے سمجھایا۔

وہ رونے لگی۔ میں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ دیکھو میں تمہارے لئے اجنبی ضرور ہوں گی مگر عمر میں تم سے بڑی ہونے کے ناتے تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں نہ آجانا۔ یہاں پچھتاوؤں کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ہم عورتیں جو عمر بھر سمجھوتے کی چادر اوڑھے قربانیاں دیتی رہتیں ہیں، ذرا سی غلطی پر کانٹوں کے ریگزار میں جا پہنچتی ہیں۔ ہمارے قصور قابل معافی نہیں ہوتے۔ عمر بھر کی ریاضتیں بھی ہماری غلطی معاف نہیں کرواسکتیں۔ ہماری عمروں کے دکھ بھی ہماری غلطی کی سفارش نہیں کر سکتے۔ ہماری غلطیاں ہمارے روگ بن جاتی ہیں۔ ہمارا پدرسری معاشرہ ہماری غلطی معاف کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ مگر مرد کے اندر چھپی ہوئی حاکمیت ہمیں نیچا دکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ حاکمیت ہر جگہ ہماری تذلیل میں پیش پیش ہے۔ مگر تم خود سوچو ہم تنہا بھی تو کچھ نہیں ہیں نا......مرد کے بغیر تنہا عورت کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ ہمیں نام دینے والے اپنے نام کی پوری قیمت وصول کرتے ہیں۔ ہمارے پر کاٹ کر ہمیں اڑان سے محروم کر دیتے ہیں۔ ہم عورتیں محرومی کے دشت میں آبلہ پائی کے لئے ہی دنیا میں آئی ہیں۔ غور کرو۔ ابھی کچھ ہی دیر میں جب رات یہاں سایہ فگن ہوگی تو بہت سی نظریں تمہارے تعاقب میں ہوں گی۔ یہ جس جگہ ہم دونوں اپنے دکھ بانٹ رہی ہیں۔ اس عظمتوں والے دربار پر بھی کچھ لوگ عصمتوں کے بیوپاری بنے ہوئے ہیں۔ ماؤں کی گود سے بچے چھین رہے ہیں۔ معصوم بچیوں کو اغوا کر رہے ہیں۔ ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ یہاں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں کتنے جرائم پیشہ ہیں، یہ کسی کو خبر نہیں۔ گھروں سے بھاگ کر آنے والے یہاں پناہ لیتے ہیں۔ پیار کرنے والے یہاں آکر چھپتے ہیں اور پیار کی آڑ میں گھناؤنا کاروبار کرنے والے بھی یہیں بسیرا کرتے ہیں۔ بے سہارا مزدور لاوارث فقیر یہاں لنگر پہ پلتے ہیں اور اپنا کاروبار تلاش کرتے ہیں۔

تم پر بھی یہاں بہت سی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ کچھ تمہارے زیورات کو تاڑ رہی ہیں اور کچھ تمہاری جوانی کے تعاقب میں ہیں۔ گھر کے جہنم سے گھبرا کر نکلی ہو، یہاں دلدل تمہاری منتظر ہے۔

سنو! ابھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا۔ بات سنبھالی جاسکتی ہے۔ گھر سے باہر گزاری گئی ایک رات تمہاری زندگی میں زہر گھول سکتی ہے۔

وہ خاموش تھی۔

جذباتی فیصلے، پچھتاوے بن کر تمام عمر جونک کی طرح چمٹے رہتے ہیں۔ اپنا گھر خراب نہ کرو۔ تمہارے دامن سے لپٹے ہوئے بہت سے رشتے تمہاری منزل کو ہمیشہ کے لئے تم سے گم کر دیں گے انہی پچھتاووں کی زنجیروں کو پیروں سے لپیٹے کتنی ہی عورتیں ہیں جو بدنصیبی کے دشت میں کتنا کٹھن سفر طے کر رہی ہیں تمہیں کیا خبر؟

کبھی میں تمہاری طرح جذباتی فیصلے کرنے کی عادی تھی۔مگر یہ جو صبر اور برداشت کا مادہ ہم عورتوں کی گھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے نا......بس اس کے سہارے ہی زندگی بدل دی میں نے۔حالات کے ساتھ خود کو بدل لینا ہی ہماری ریت ہے۔ہمیں کی گئی نصیحت ہے۔ میں بھی تمہیں یہی نصیحت کروں گی کہ کہانی بننے کی بجائے حقیقت بن جاؤ۔ ایک ایسی خوبصورت حقیقت جسے لوگ دیکھیں تو آنکھیں نہ چرائیں، بلکہ فخر کریں،تمہاری مثال دیں۔

میں کون ہوں؟

کتنی دکھی ہوں؟

یہ نہ پوچھنا۔بس سمجھ لینا......سرِ راہ یونہی ایک عورت ملی تھی جسے یاد رکھنا اتنا ضروری بھی نہیں۔وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میری آنکھوں سے اشکوں کے دو قطرے ٹپکے اور جھولی میں آگرے۔

میں نے اسے پیار دیا۔اپنا بیگ سنبھالا اور اللہ والے کی درگاہ سے نکل آئی۔میرے کان ایک خوبصورت چاپ سن رہے تھے وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

شاید اس نے میری بات مان لی تھی۔

شاید میں نے ایک گھر ٹوٹنے سے بچالیا تھا۔

☆☆☆

زینب طارق

# بیداری

میں چاند کی سیر کر رہی تھی ۔ یہ میرے بچپن کی خواہش تھی ۔ ہمیشہ اسے دور سے دیکھتی تھی اور ہزار ہا کہانیاں سنتی تھی اس کے بارے میں ۔ چرخہ کاتنے والی بڑھیا کا یہاں نام ونشان بھی نہ تھا۔ بلکہ میرا چاند تو زمین سے دکھائی دینے والے چاند سے بالکل ہی فرق ہیئت کا تھا۔ یہاں اونچے اونچے پہاڑ بھی تھے اور ان پر گھنے جنگلات بھی۔ مگر فضا میں ایک پراسراریت رچی بسی تھی۔ اس کی زمین پر سفید رنگ کی بھربھری ریت تھی جس میں پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ راستے بھی بہت خطرناک اور پر پیچ تھے، پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتے تھے کیونکہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کہاں سے زمین اندر کو گر جائے اور کس درخت کے پیچھے سے کیا نکلے؟ مگر اس سب کے باوجود مجھے اپنا چاند بہت پسند آیا تھا۔

میں نہ جانے کتنی دیر خواب میں چاند پر ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہی کہ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے پہل تو مجھے سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا ہوا ہے؟ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوں مگر اگلے ہی لمحے حقیقت ایک پتھر کی طرح مجھے لگی۔ میں ڈوب رہی تھی بے پناہ پانی کے اندر، پانی میرے اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف تھا۔ ڈوبنے والا فرد کیسی شدید اذیت سے گزرتا ہے؟ اس کو الفاظ میں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے میرا سینہ جل رہا تھا۔ آنکھوں، کانوں، منہ اور ناک ہر جگہ پانی گھس رہا تھا۔ میرا وزن مجھے نیچے کی جانب کھینچ رہا تھا۔ موت کے خوف نے مجھے ایک شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ کاش! یہ بھی بس ایک خواب ہی ہو، میں سو کر اٹھوں تو یہ سب نہ ہو، میں نے سوچا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں، دوبارہ اپنے پرانے خواب کو یاد کر کے سونے کی کوشش کی مگر ایک دفعہ جاگ کر دوبارہ سونا ناممکن تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں، اپنی زندگی بچانے کا داعیہ ہر انسان کے اندر ہوتا ہے اور یہ باقی ہر چیز سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ میں نے پہلے سے زیادہ زور سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ پانی کے ساتھ لڑنا بہت مشکل تھا مگر زندہ رہنے کچھیا تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ کس انداز میں تیرنے سے زیادہ نیچے جاتی ہوں اور کس سے اوپر۔ میں نے اور زیادہ جوش سے بازوؤں کو حرکت دینا شروع کی، کچھ ہی دیر میں میں آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھنا شروع ہو گئی۔ اتنی محنت کرنی پڑ رہی تھی کہ جسم میں درد شروع ہو گیا تھا مگر اب امید بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر دفعہ زور لگانے کے بعد پانی کی سطح سے مزید قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی نجات قریب دکھائی دے رہی تھی۔ اسی امید پر میں نے اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دی تھیں۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کئی صدیوں کے بعد میں سطح تک پہنچی ہوں۔ اوپر پہنچ کر جب میں نے سانس لیا تو ایسا لگا جیسے دنیا کی تمام فرحتیں اسی میں سمٹ آئی ہوں۔ میں بچ گئی تھی، میں زندہ تھی! اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔

موت سے زیادہ بڑا دشمن کون ہے؟ اس زیادہ بڑا خسارہ یا زیادہ بڑی ناکامی کوئی نہیں اور ابھی ابھی اس موت کو میں نے شکست فاش دی تھی۔ کھلی ہوا میں سانس لینے کا مزہ ہی اور تھا جب سرشاری کی یہ کیفیت ذرا کم ہوئی اور اس حقیقت کی دنیا میں واپس آئی تو میں نے پانی سے مکمل طور پر باہر نکلنے کا ارادہ کیا اور تب مجھے پتہ چلا کہ میں ایک خاص حد سے زیادہ باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کی وجہ بھی جلد ہی سمجھ میں آ گئی۔ میرے پاؤں کے ساتھ ایک موٹی زنجیر بندھی ہوئی تھی جو نیچے پانی کی تہوں میں کہیں جا رہی تھی اب اس لمحے کی پریشانی بھی میں بتا نہیں سکتی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ مجھے زندگی مل گئی ہے اور اب......اب ہر جگہ اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

پانی کی لہریں اٹھ اٹھ کر مجھ پر گر رہی تھیں، زنجیر نہ بھی ہوتی تو بھی اکیلے ان کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ کسی موہوم امید پر میں نے زنجیر کھینچی، وہ بھاری اور مضبوط تھی مگر پھر بھی مجھے نیچے کہیں ہلچل پیدا ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاید وہ کسی چیز کے اندر پھنسی ہوئی ہو اور اس کو نکالا جا سکتا ہو۔ یہ سوچ کر ایک گہرا سانس لے کر میں نے نیچے کی طرف غوطہ لگا دیا۔ نیچے جانے میں تو کوئی مشکل نہیں ہوئی مگر وہاں جو منظر تھا اسے دیکھ کر بھی میں حیران و پریشان رہ گئی۔ زنجیر نیچے جا کر میری امی کے پاؤں سے بندھی ہوئی تھی اور میری امی......وہاں سب سے بے نیاز سو رہی تھیں۔ انہیں ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا کہ وہ پانی کی قبر میں پڑی ہیں، چند ہی لمحوں کے بعد ان کے پھیپھڑوں میں ہوا نے ختم ہو جانا تھا اور انہوں نے بے خبری کی نیند سے نکل کر موت کی نیند سو جانا تھا۔ میرا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ اپنی امی کے بغیر میں بچ بھی جاتی تو کیا فائدہ تھا ایسے بچنے کا؟ میں تیزی سے آگے بڑھی اور زور زور سے امی کو جھنجوڑا میں اس قدر پریشان تھی کہ ابھی وہ صحیح سے اٹھی بھی نہیں تھیں کہ میں انہیں بازو سے پکڑ کر اوپر کی جانب کھینچنے لگی، تب ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔ پہلے پہل تو انہیں بھی کچھ سمجھ نہ آیا اور وہ بھی حیرانی، پریشانی کی اسی کیفیت میں تھیں جس سے شروع میں میں گزری تھی۔ مگر جلد ہی میں نے انہیں تیرنے کا وہ انداز سمجھا دیا اور وہ بھی آہستہ آہستہ میری مدد کے ساتھ اوپر اٹھنا شروع ہو گئیں۔ 'اف میرے خدا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ اوپر پہنچ کر امی نے پریشانی سے پوچھا، میں اتنا خوبصورت خواب دیکھ رہی تھی کہ اچانک یہ......'

''میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے میں بھی خواب دیکھ رہی تھی کہ اچانک ہی پتہ نہیں کیوں میری آنکھ کھل گئی، اف امی! مجھے اتنی مشکل ہوئی ادھر اوپر تک آنے میں اور اوپر آ کر مجھے اپنے پاؤں سے بندھی زنجیر کا پتہ چلا مگر شکر ہے پتہ چل گیا ورنہ آپ تو اب تک ڈوب چکی ہوتیں۔'' میں نے انہیں بتایا۔

''ہائے اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے خواب سے جگا دیا مگر اب تو مجھے بھی اپنے پاؤں کے ساتھ زنجیر بندھی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ کیا کوئی اور ہو گا نیچے؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا

''پتہ نہیں نیچے جا کر دیکھنا پڑے گا میری زنجیر ابھی بھی نیچے جا رہی ہے، جب تک نیچے والی چیز کو اوپر نہیں لائیں گے تب تک ہم خود بھی نہیں بچ سکتے'' میں نے کہا۔

''چلو پھر جلدی کرو'' امی فوراً ہی پلٹ گئیں۔

میں امی کے پیچھے تھی۔ اچانک ہی مجھے ان کی خوفزدہ سی چیخ سنائی دی اور وہ رک گئیں۔ حیرتناک بات یہ تھی کہ پانی کے اندر بھی مجھے آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ سامنے ابو لیٹے ہوئے سو رہے ہیں۔ یہ صدمہ علی صدمہ والی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ ہائے ابو جان! جلدی

کریں اٹھ جائیں، جلدی کریں۔میں ابو کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔امی ساتھ کھڑی ان کے کندھے جھنجوڑنے لگیں، اٹھ جائیں، دیکھیں، جلدی کریں، مگر ابو بہت گہری نیند میں تھے وہ تو اپنے خواب میں باقاعدہ بڑبڑا رہے تھے کہہ رہے تھے'' گاڑی کافی پرانی ہے، اچھی نہیں، پھٹ پھٹ، کچ کچ، نرا سر درد، عرفان کی اچھی ہے ماڈل بھی نیا ہے۔سوچ رہا''

''ہائے ابو جان! جلدی کریں اٹھیں آپ ڈوب جائیں گے'' میرے آنسو بہنے لگے امی بھی بہت پریشان ہو رہی تھیں، وہ بیچاری تو ابو کو ہلا ہلا کر صرف اٹھیں، اٹھیں کے الفاظ دہرائے جا رہی تھیں۔بڑی کوشش کے بعد ابو نے ذرا سی آنکھیں کھولیں'' کیا بات ہے؟ انہوں نے نیم خوابیدگی میں کہا۔ہم دونوں چیخ رہی تھیں۔ابو اٹھ جائیں ورنہ ہم سب ڈوب جائیں گے، مر جائیں گے'' ابو گھبرا کر اٹھے مگر انہیں کافی جلدی سمجھ آ گئی۔وہ میرے اور امی کی طرح بہت زیادہ پریشان نہیں ہوئے بلکہ فوراً ہی تیرنا شروع ہو گئے۔اوپر پہنچ کر میں نے ابو کو اپنی اور امی کی کہانی سنائی۔

ابو کہنے لگے'' ادھر بہت سارے لوگ ہوں گے۔سب کو جگانا پڑے گا سب ہی اتنے بڑے خسارے میں پڑے ہیں۔اللہ سے دعائیں کرو۔ہم ایک سخت آزمائش میں گھر چکے ہیں''

امی پریشانی سے روتی ہوئی کہنے لگیں'' مجھے تو باقی بچوں کی فکر ہو رہی ہے نجانے کہاں ہیں؟ کتنی سانسیں بچی ہیں انکے پاس؟ ہائے میرے رب! ہم سب کو بچالے۔''

یہ کہہ کر امی فوراً نیچے سب کو ڈھونڈنے چلی گئیں ابو اور میں بھی ان کے پیچھے لپکے۔ہم سب الگ الگ سمتوں میں تلاش کر رہے تھے کیونکہ وقت بہت ہی کم تھا اور سونے والے کے بارے میں کیا پتہ کہ وہ اٹھنے میں کتنا وقت لے۔قریب ہی مجھے اپنی چھوٹی بہن نظر آئی۔مگر امی مجھ سے پہلے اس تک پہنچ چکی تھیں اور اسے جگا رہی تھیں مجھے قریب آتے دیکھ کر انہوں نے مجھے کہا کہ میں اس کو اٹھاؤں اور خود جلدی سے میرے بھائی کی طرف بڑھ گئیں۔

اس طرح ہم بہت دیر لگے رہے، شکر ہے میرے گھر کے تمام افراد جلد اٹھ گئے مگر ہم نے دیکھا کہ گھر کے تمام افراد کے جاگ جانے کے بعد بھی زنجیریں ختم نہیں ہوئیں۔مجھے اپنی کزنز سوتے ہوئے ملیں اور دوستیں بھی، کچھ لوگ جلدی اٹھ جاتے کچھ دیر لگا کر اور کچھ اتنی دیر لگاتے کہ میرا اپنا سانس گھٹنے لگتا۔میں دو تین دفعہ سانس بھر بھر کر ان کے پاس جاتی مگر وہ نہ اٹھتے تب میں انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف چلی جاتی۔ایک دفعہ مجھے اپنی کلاس فیلو سمیعہ نظر آئی۔اس لڑکی سے میری زندگی میں کبھی نہیں بنی تھی، ضرور کسی نہ کسی بات پر ہمارا اختلاف ہوتا اور تلخ کلامی ہو جاتی۔اسے اس طرح پانی میں پڑے دیکھ کر مجھے ترس آ گیا میں اس کے قریب گئی تو دیکھا کہ وہ اپنے خواب میں اس قدر مگن تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں حرکت کر رہے تھے۔اس کے ہاتھ بار بار اٹھ کر بالوں کی طرف جاتے جنہیں وہ بناتی سنوارتی اور پھر اپنے کپڑوں پر یوں پھیرتی گویا انکی سلوٹیں درست کر رہی ہو۔اس بیچاری کو ذرا سا بھی احساس نہیں تھا کہ اس کے پاس آکسیجن کی کس قدر کم مقدار رہ گئی ہے۔وہ کتنے بڑے نقصان کے دہانے پر کھڑی ہے کیسا زبردست خسارہ ہے کہ ایک خواب کے پیچھے اپنی زندگی ضائع کرنے چلی ہے؟ میں نے اس کو ہلایا اور بولی'' سمیعہ، سمعیہ اٹھو، اٹھو، دیکھو تم ڈوبنے والی ہو مگر وہ نیند میں مدہوش، میرا ہاتھ جھٹک کر دوبارہ اپنے کاموں میں مشغول ہو گئی۔اب میں نے اسے زور سے ہلایا اور بولی اٹھ

جاؤ، جلدی کرو، اس نے جھنجلا کر ذرا سی آنکھ کھول کر مجھے دیکھا اور بولی ''اف توبہ تم اجڈ انسان! تمہیں کسی نے etiquette نہیں سکھائے۔ جاؤ ادھر سے، مجھے تنگ نہ کرو' غصے سے میرے اندر تک آگ لگ گئی تھی۔ میں اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی اور آگے سے یہ انداز۔ میں پیر پٹخ کر وہاں سے مڑی اور دوسری طرف جانے لگی۔ مگر میرے پاؤں میں پڑی زنجیر اس قدر سخت ہوگئی کہ میں ذرا سا بھی ہل نہیں سکی۔ میں نے اوپر کی طرف اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ میرے پاؤں کو کاٹنے لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو زنجیر سمیعہ کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اب اس کے بغیر میں ذرا سا بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسے پہلے دفعہ ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ پوری کوشش کی ہلنے کی مگر زنجیر بہت زیادہ سخت ہوگئی تھی ایک دم مجھے گھبراہٹ ہونے لگی میں سمیعہ کی طرف پلٹی اور اس کا ہاتھ ہلا کر پیار سے کہنے لگی، سمیعہ، سمیعہ پلیز آنکھیں کھول کر ذرا دیکھو سمیعہ، دیکھو، ورنہ تم ڈوب جاؤ گی' وہ پہلے کی طرح کسمسائی مگر اس دفعہ اس نے بدتمیزی نہ کی میں برابر اس کو آہستہ آہستہ ہلاتی رہی یہاں تک وہ اٹھ گئی اٹھ کر اپنے آپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر وہ تو شاک میں ہی آ گئی مگر میں اس کی مدد کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے اوپر لے ہی آئی۔

اوپر اور بھی بہت سارے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ہم دونوں بھی اپنی سانس درست کر رہے تھے جب میرے بھائی نے اپنا سر پانی سے نکالا اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ ٹپک رہی تھی وہ غصے سے کہنے لگا 'میں تھک گیا ہوں ان سب لوگوں کو ان ہی کی بہتری کچھ یا اٹھا رہا ہوں اور وہ اٹھ ہی نہیں رہے، نیند میں ہی آگے سے باتیں بناتے ہیں اور کئی ایک تو ایسے بھی ہیں کہ اٹھنے کے بعد دوبارہ سو جاتے ہیں۔ ہم کیوں ان احمقوں کے ساتھ اپنا وقت ضائع کریں'۔

قریب ہی ایک صاحب فوراً بولے ''نہیں! ہم ہرگز ایسے نہیں کر سکتے ہم سب آپس میں بندھے ہوئے ہیں ہمیں مرضی کے تحت ان کو نہیں اٹھانا بلکہ ہم سب کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔ ہمیں اکٹھا رہنا ہوگا۔ اگر ہم نے باقیوں کا خیال نہ کیا تو ہم سب مر جائیں گے۔''

ابو کہنے لگے۔ بیٹا! ہم سب ہی تو اسی خواب کی حالت میں تھے۔ اللہ نے ہم پر رحم کیا اور ہمیں جگا دیا۔ ہمارا فرض ہے کہ ان سب پر بھی پوری کوشش کریں۔ صبر کرو اہل ایمان کا سب سے بڑا ہتھیار اللہ پر ایمان اور صبر ہی ہے۔

بھائی نے ابو کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ ایک ایک کر کے سب دوبارہ نیچے جانے لگے۔

جب پانی اترا تو ہم نے دیکھا کہ زمین لاشوں سے اٹی پڑی ہے۔ مرنے والوں کے مقابلے میں بچنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ یہ بھی اللہ کا فضل اور رحم تھا ورنہ ہم اس قابل نہ تھے ہر بات کھول کھول کر بیان کر دی گئی تھی مگر انسان ظالم اور جاہل تھا۔ وہ وقتی، چھوٹی اور بے حقیقت لذت کو ترجیح دے بیٹھا تھا اور ایک عظیم خسارے کا سودا کر بیٹھا۔

''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے!''

☆☆☆

# ایک تھا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ بادشاہ کا نام اسادا تھا۔

جب اسادا بوڑھا ہو گیا تو اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی جیسے کہ ہر بادشاہ کو ہوتی ہے کہ کہیں راج پاٹ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

بادشاہ اسادا سوچ سوچ کر ہار گیا کہ کون سا طریقِ کار اختیار کرے۔ چونکہ بادشاہ تھا۔ لہٰذا کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دل کی بات کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ بادشاہ، لقمان کے اس کوے کا مصداق ہوتا ہے جو منہ میں پنیر کا ٹکڑا پکڑے درخت پر بیٹھا ہو۔ درخت کے نیچے مشیر، وزیر کھڑے یک زبان ہو کر کہہ رہے ہوں ''شاہ عالم آپ کتنے خوش گفتار ہیں۔ بولتے ہیں تو پھول جھڑتے ہیں۔'' پھول جھڑیں یا نہ جھڑیں پنیر کا ٹکڑا منہ میں ہو تو کیسے بات کرے۔

شاہ اسادا کا وزیر باتدبیر تھا۔ جیسے وزیر ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس حد تک باتدبیر تھا کہ بادشاہ خود اس کی باتدبیری سے خوف زدہ تھا۔

وزیر، بادشاہ کی فکرمندی بھانپ گیا۔ ایک روز موقع پا کر تخلیے میں بولا: ''عالی جاہ! میری گردن کاٹنے کا حکم صادر فرمایئے۔''

بادشاہ یہ سن کر حیران ہوا۔ بولا ''تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ میں ایسا حکم صادر کروں۔''

وزیر بولا ''شاہ عالم، اگر بادشاہ سلامت کی پیشانی پر فکر مندی کی سلوٹیں موجود ہوں تو بے شک وزیر گردن زدنی ہوتا ہے۔ عالی جاہ سیانے کہتے ہیں اگر کوئی بات چھپانی مقصود ہو تو اسے ایسے چھپاؤ کہ برتاؤ کے کسی دریچے سے جھانکنے نہ پائے۔ اور اگر جھانکے تو پھر چھپانا سعی لاحاصل ہے۔ اور عالم پناہ! بادشاہ سلامت کو سعی لاحاصل زیب نہیں دیتی۔''

اب بادشاہ کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔ بولا ''وزیر باتدبیر ہم چاہتے ہیں کہ جیتے جی راج پاٹ اپنے بڑے بیٹے کو سونپ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔''

وزیر نے جواب دیا ''عالی جاہ! اس میں فکرمندی کی کیا بات ہے۔ حکم دیجیے تعمیل ارشاد ہو گی۔''

بادشاہ نے کہا ''وزیر باتدبیر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔''

وزیر بولا ''شاہ عالم! ویسے تو حکم پر سرِ تسلیم خم ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ بادشاہ کا بیٹا نہیں ہوتا، اور شہزادے کا باپ نہیں ہوتا۔ آگے آپ مالک ہیں۔''

یہ سن کر بادشاہ گھبرا گیا لیکن خاموش رہا۔

وزیر نے اپنی بات جاری رکھی۔ کہنے لگا ''عالی جاہ! شہزادہ ساجھانا گزشتہ آٹھ سال سے یورپ میں یونیورسٹی آف ویسٹرن آرٹس اینڈ سائنس میں زیرِ تعلیم ہے۔ شہزادے کی تاجپوشی کا اعلان کرنے سے پہلے ان کا عندیہ معلوم کرنا مناسب رہے گا۔ حکم ہو تو شہزادہ سلامت کو بلانے کے لیے ایلچی روانہ کر دیا جائے۔''

شہزادے کی آمد کے بعد بادشاہ اور وزیر حیران رہ گئے کہ ساجھانا کسی صورت بادشاہ بننے پر رضامند نہ تھا۔

اس میں شہزادے کا کوئی قصور نہ تھا۔ سالہا سال مغربی یونیورسٹی میں تعلیم وتربیت پانے کے بعد وہ بادشاہ کے نام سے ہی الرجک ہو چکا تھا۔

وزیر بولا ''شہزادہ سلامت! آپ کتاب وشنید کے چکر میں آ چکے ہیں۔ یہ کتابی علم جو درس گاہوں میں رائج ہے عملی زندگی میں نہیں چلتا۔''

شہزادے نے جواب دیا ''محترم وزیر! بادشاہ پرانے زمانے کی چیز ہے۔ وہ مدت سے مر چکا ہے۔ آپ مجھے بادشاہ بنا کر مرحوم ومغفور نہ کریں۔ میں زندہ رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

وزیر بولا ''شہزادہ عالی! یہ کہنا کہ بادشاہ مر چکا ہے ایک کتابی خوش فہمی ہے۔ عملی زندگی میں آج بھی جوں کا توں زندہ پائندہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ نے بھیس بدل لیا ہے خود کو کیمافلاج کر لیا ہے۔ کہیں وہ سفید کپڑوں میں چھپا بیٹھا ہے کہیں خاص قسم کے لباس میں۔ کہیں نمائندے کا سوانگ رچائے بیٹھا ہے کہیں سامراجی طاقتوں کے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ کہیں عوام کی محبت کی بھبھوت ملے بیٹھا ہے۔ کہیں خدمت خلق کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ شہزادہ سلامت! یاد رکھیے کہ بھیس بدلنے سے کردار نہیں بدلتا۔''

''یہ بھیس بدلنے کی رسم بھی نئی نہیں'' بادشاہ نے کہا ''بلکہ صدیوں پرانی ہے۔ پرانے زمانوں میں بھی بادشاہ بھیس بدل کر شہر گھوما کرتے تھے کہ عوام سے رابطہ قائم ہو۔''

وزیر نے بادشاہ کی بات کاٹی۔ بولا ''گستاخی معاف عالم پناہ! لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ عوام سمجھیں کہ وہ ان سے رابطہ پیدا نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسا طرز عمل اپنائیں کہ عوام سمجھیں کہ وہ ان سے رابطہ پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔''

بادشاہ نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا ''شہزادہ ساجھانا! تم اپنے چچا آدورا کی مثال سامنے رکھو۔''

''چچا تو بادشاہ نہ تھے۔'' ساجھانا بولا ''وہ تو عوام کے منتخب نمائندے تھے۔''

''بے شک بے شک آپ درست فرماتے ہیں شہزادہ سلامت!'' وزیر باتدبیر نے حامی بھری ''عوام آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ شاہ آدورا بادشاہ نہ تھے اور وہ کوئی کام عوام کی مرضی پوچھے بغیر نہ کرتے تھے۔ عالی جاہ! بادشاہ کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ بادشاہ تو ہو لیکن عوام اسے بادشاہ نہ سمجھیں۔''

''بے شک بے شک۔ شاہ نے وزیر پر تحسین بھری نگاہ ڈالی۔''

وزیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ بولا ''شاہ آدورا عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان کی نظر میں ایسا جادو تھا وہ محبت سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ جب وہ زبان کی لاٹھی چلاتے تھے تو عوام فرطِ محبت سے دم ہلانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔''

شہزادہ اپنے چچا کا پرستار تھا، وزیر کی بات سن کر اسے دھچکا لگا، بولا: ''بادشاہ سلامت! سفر کی کوفت کی وجہ سے میں بہت تھک گیا ہوں اجازت ہو تو آرام کر لوں۔''

ظاہر ہے کہ شہزادے پر پند ونصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ مغربی رنگ میں رنگا ہوا ایک نوجوان تھا۔

اسی رات جب بادشاہ، ملکہ اکلیمہ کے پاس پہنچا تو وہ ایک ہی نظر میں تاڑ گئی کہ سارنگی کے تار ڈھیلے پڑے ہوئے ہیں۔

ملکہ اکلیمہ بڑی سیانی تھی۔ ویسے تو ہر عورت سیانی ہوتی

ہے۔ چونکہ اسے ایک ڈھکے چھپے ظلِ الٰہی کے ساتھ رہنا سہنا پڑتا ہے۔ رہنا کم سہنا زیادہ۔لیکن ملکہ تو ایک ننگ دھڑنگ ظل الٰہی کے زیرِسایہ تھی اس لیے کچھ زیادہ ہی سیانی تھی۔اس کے لیے زندگی گویا شطرنج کی بساط تھی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ضرور ہے۔ کشش ثقل کی روک نہ ہو تو بوٹا اُگ نہیں سکتا۔ بندشوں کے کانٹے نہ ہوں تو گلاب پھول نہیں بن سکتا۔

خیر بادشاہ کو دیکھتے ہی ملکہ سمجھ گئی کہ پیشانی کی سلوٹوں میں دبی ہوئی بات ہونٹوں پر اترنے والی ہے۔ لہٰذا وہ رنگ روپ نازنخرے کے پیادے چلانے میں مصروف ہوگئی۔

جس طرح عورت کا کام یہ ہوتا ہے کہ مرد سے معتبری کا چھچھیڑا اتار کر اندر سے کھلنڈرا بچہ نکال لے۔اسی طرح ملکہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ظل الٰہی کا پتھر توڑ کر اندر کا انسان باہر نکالے۔ انسان باہر نکلا تو اس نے ساری بات ملکہ کو بتا دی۔

شاہ کی بات سن کر ملکہ بولی:''عالی جاہ! بادشاہت ایک میوہ ہے، ایک بار اس کا سواد چکھ لو تو منہ کو لگ جاتا ہے۔ پھر چھوڑنے سے نہیں چھوٹتا۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ شہزادہ بادشاہ بننا قبول کرلے تو پہلے اس میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا کیجئے۔ پھل کا سواد چکھائیے۔چاٹ لگائیے۔''

''سواد کیسے چکھائیں؟'' بادشاہ نے پوچھا

''پہلے اسے جلسے جلوسوں میں لے جائیں۔محل سے نکلے تو طوطیاں بجیں۔ بازاروں سے گزرے تو سیکورٹی کی موٹریں، چلاؤں چلاؤں کرتی ہوئی آگے آگے دوڑیں۔ ٹریفک بند ہوجائے۔ پولیس والے راستے روک کر کھڑے ہوجائیں۔وہ چلتوں کو روک روک زبردستی دورویہ کھڑا کردیں جیسے وہ خیرمقدم کے لیے گھر سے نکلے ہوں تاکہ شہزادہ سمجھے کہ وہ لوگ نہیں پروانے ہیں۔جلسوں میں پرجوش استقبال ہوں۔ زندہ باد کے نعرے لگیں۔ پھول برسائے جائیں۔فوٹوگرافر تصویریں کھینچیں۔ اخبار شہ سرخیاں سجائیں، تصویریں لگائیں۔ریڈیو اور ٹی وی والے ان مصور خبروں کو دہرا دہرا کر ناظرین وسامعین کو مفرح کریں۔لیکن ٹھہریئے شاہ عالم'' ملکہ رک گئی۔''پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیجئے کیا شہزادے کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ درست ہے۔''

اس پر بادشاہ کے پیشانی پر بل پڑ گئے بولا''کیا مطلب ہے تمہارا ملکہ اکلیمہ ؟''

ملکہ بولی''عالی جاہ! اگر شہزادے کے منہ کو بادشاہت کا سواد لگ گیا تو وہ بادشاہ بننے کے لئے اتنا بے صبرا ہوجائے گا کہ آپ نہ بنائیں تو بننے کے خواب دیکھے گا۔اور بن گیا تو وہ بیٹا بن کر نہیں جیے گا۔ظلِ الٰہی سیانے کہتے ہیں،شیر اس وقت تک شیر نہیں بنتا جب تک اس کے منہ کو خون نہ لگ جائے۔''اس پر بادشاہ چپ ہوگیا اور سوچ میں پڑ گیا۔

بہرصورت بادشاہ نے حکم صادر کردیا کہ شہزادے کو جلسے جلوسوں میں گھمایا پھرایا جائے۔

وزیرِباتدبیر بولا''عالی جاہ! اگر نشر وتشہیر مقصود ہو تو بہتر ہوگا کہ آپ ذرائع ابلاغ کے محکمے والوں سے مل کر اپنا عندیہ بیان کریں۔''

ذرائع ابلاغ کا سربراہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے برسبیل تذکرہ پوچھا''آپ کا محکمہ کیا کام کرتا ہے؟''

اس پر سربراہ گھبراہ گیا۔ بولا''شاہ عالم جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔''

شاہ نے امان دے دی تو وہ بولا''عالی جاہ! ہمارے دو کام ہیں، ایک یہ کہ بادشاہ کو حقیقت حال کی خبر نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ عوام میں یہ گمان پیدا کیا جائے کہ انہیں صورت حال سے باخبر رکھا جارہا ہے۔''

بادشاہ کی سمجھ میں بات نہ آئی بولا ''بات ہمارے پلے نہیں پڑی۔''

اس پر سربراہ کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا ''عالی جاہ! یہی ہمارا کام ہے کہ بات کہہ دی جائے لیکن پلے نہ پڑے۔ عالی جاہ! ہم پر اعتماد کیجئے۔ ہم ٹیکنیکل ایکسپرٹ ہیں۔ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیں گے۔ صرف یہ فرمادیجئے کہ مقصود کیا ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا ''ہم چاہتے ہیں کہ شہزادے کے دل میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا ہوجائے۔''

سربراہ یہ سن کر گھبرا گیا، بولا ''شاہ عالم! یہ تو ایک خطرناک بات ہوگی۔ اسکے علاوہ یہ طریق کار پرانا ہے۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ عوام پُرزور مطالبہ کریں کہ شہزادہ گدی سنبھال لے۔ ان کے اس پُرزور مطالبہ سے مجبور ہوکر شہزادہ تخت نشینی پر رضامند ہوجائے گا۔''

''آپ عوام کو رضامند کیسے کریں گے؟'' شاہ نے پوچھا

''عالی جاہ!'' سربراہ بولا ''عوام رضامند ہوں نہ ہوں۔ ہم بار بار اعلان کریں گے کہ عوام کا مطالبہ ہے۔ اس بات کو اتنی بار دہرائیں گے کہ عوام سمجھنے لگیں گے کہ واقعی یہ ہمارا مطالبہ ہے اور یہ گمان کہ شہزادے نے ان کی خواہشات پر سرتسلیم خم کردیا ہے۔ ان کے لیے کتنی تسکین کا باعث ہوگا۔''

تو جناب دفتر پہنچ کر سربراہ نے احکامات جاری کردیئے کہ فی الفور ایسے اقدامات کیے جائیں کہ شہزادہ عوام کی آنکھوں کا تارا بن جائے۔ اس پر محکمے کے کارکن فوراً حرکت میں آ گئے۔ شہزادے کی تصاویر کھنچی گئیں۔ آرٹسٹوں نے ان تصاویر میں رنگ بھرے، ساجھانا کی سپاٹ آنکھوں میں گلیڈ آئی چمکنے لگی، کھلی اور خالی پیشانی پر مردانہ گھوری آ بیٹھی۔ سیدھے ہونٹ خم آلود ہوگئے۔

اس کے بعد اخباروں اور رسائل کے نام ایک سرکلر آرڈر روانہ کیا جس میں ان تصویروں کی کاپیاں ملفوف تھیں تاکہ ان تصاویر کے علاوہ شہزادے کی کوئی اور تصویر اخباروں میں نہ چھپے۔ اخباروں میں ان تصاویر کو جو بھی لڑکی دیکھتی اسے ایسا لگتا جیسے شہزادہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس کی نگاہوں میں اس کے لئے ایک خاص الخاص پیغام ہے۔

اس کے فوراً بعد شہزادے کا ایک انٹرویو چھپا جسے محکمے والوں نے مرتب کیا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں شہزادے نے کہا میں شاہی خاندان کی لڑکی سے نہیں بلکہ عام ورکنگ ویمن سے شادی کروں گا۔ میں ذات پات، عہدے، مرتبے کا قائل نہیں البتہ لڑکی سمارٹ ہو، ذہین ہو، کلچرڈ ہو۔ ضروری نہیں کہ خدوخالی یا گوری ہو۔

اس اعلان کے بعد شہزادے کے جلسوں اور جلوسوں میں لڑکیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ لقنا بازار کا شبہ پڑنے لگا۔

اُدھر وزیر باتدبیر نے شاہ کی خدمت میں گزارش کی کہ ''عالی جاہ! جلسے جلوسوں کا پروگرام لانگ رینج پروگرام ہے فوری نتائج کے لیے مناسب ہوگا کہ شہزادے کو سمجھانے بجھانے کے لئے ایک ٹیوٹر مقرر کردیا جائے۔ جسے عرف عام میں کمپینیئن کہا جائے تاکہ شہزادہ بدظن نہ ہو۔ میری رائے میں کمپینئن مغربی رنگ میں رنگا ہوا ہوتا کہ شہزادے پر اثر انداز ہوسکے۔''

اس مقصد کے لیے محکمہ تعلقات عامہ نے یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں سے انٹرویو کیے اور آخری ایک اڈھیڑ عمر کی ڈپلومیٹک ریلیشنز کی ڈاکٹر مادام زبوری کو منتخب کرلیا گیا۔ فائنل اپروول کے لیے مادام کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔

بادشاہ نے پوچھا''محترمہ! آج کل بادشاہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟''

مادام بولی''عالی جاہ! دنیا میں بادشاہوں کے لیے صرف ایک ہی مسئلہ ہے جو باوا آدم سے آج تاک جوں کوتوں قائم ودائم ہے اور وہ ہے لاٹھی اور بھینس کا مسئلہ۔ پہلے یہ مسئلہ افراد تک محدود تھا پھر قبیلوں تک جا پہنچا اور آج کل اقوام پر حاوی ہو چکا ہے۔''

''وہ کس طرح؟''شاہ نے مزید کریدا

مادام نے جواب دیا''شاہ عالم! آج کی دنیا میں کچھ قومیں لاٹھی ہیں باقی بھینس قومیں ہیں۔ لاٹھی قوموں کی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بھینسوں کو ہانک کر اپنے گلے میں لے جائیں، ان کا دودھ پیئیں، کھال سے اپنے لیے جوتے بنائیں۔ عالی جاہ! بھینس کی خواہش ہے کہ اپنے تحفظ کے لیے کسی لاٹھی قوم کو اپنا لے۔ لیکن در پردہ ہر بھینس قوم چاہتی ہے کہ وہ بھی لاٹھی بن جائے۔''

''وہ کیوں؟''بادشاہ نے پوچھا۔

مادام نے جواب دیا''عالی جاہ! قدرت کا اصول ہے کہ ایٹ آربی ایٹن اگر تم لاٹھی نہیں بنو گے تو یقیناً بھینس بنا لئے جاؤ گے۔''

وزیر با تدبیر جو اس دوران خاموشی سے مادام کی باتیں سنتا رہا تھا بولا''مادام! بتایئے کہ بادشاہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

مادام بولی''محترم! بادشاہ خود ایک لاٹھی ہے جو بظاہر عوام کو سہارا دیتی ہے لیکن در پردہ انہیں ہانکتی ہے۔''

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے مادام کو شہزادے کا کیمپیئن مقرر کر دیا۔

جب بادشاہ کی والدہ راج ملکہ کو مادام کی تعیناتی کا علم ہوا تو اس نے احتجاج کیا۔ بولی''بیٹے تم نے مادام کو شہزادے کا ساتھی بنا کر اچھا نہیں کیا۔''

بادشاہ نے جواب دیا''والدہ محترمہ! مادام ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ شہزادے کی ماں بجا ہے۔''

''یہی تو ڈر ہے''راج ملکہ بولی''اگر وہ نوجوان ہوتی تو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ماں بجا عورت گود میں ڈالنے کا گر جانتی ہے۔ شہزادے کو راہ راست پر لانا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کا بیاہ کر دیتے، شہزادہ چاہے بادشاہ بننے پر رضامند نہیں لیکن اس کی بیوی ملکہ بننے پر مچل جاتی پھر کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا۔''

بادشاہ نے کہا'' آپ بجا فرماتی ہیں، ہم جلد از جلد شہزادے کے بیاہ کے انتظامات کر دیں گے۔''اس پر راج ملکہ مطمئن ہوگئی۔

اُدھر شہزادے کو علم تھا کہ مادام اس کی اتالیق مقرر کی گئی ہے تاکہ اسے سمجھائے بجھائے۔ اس لیے اس نے مادام سے سرد مہری اختیار کر لی۔ مادام نے اس سرد مہری کو درخور نہ اعتنا سمجھا اور ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

شہزادہ آخر نوجوان تھا، کچا تھا، ایک روز پھوٹ پڑا، مادام سے کہنے لگا''مجھے پتہ ہے آپ مجھے سمجھانے بجھانے پر مامور کی گئی ہیں۔''

''ہاں''مادام نے اثبات میں سر ہلا دیا''شاہ عالم یہی سمجھتے ہیں کہ میں شہزادہ سلامت کو سمجھانے بجھانے پر مامور ہوں۔''

یہ سن کر شہزادہ بوکھلا گیا۔ بولا''اور آپ کیا سمجھتی ہیں؟''

مادام بولی''میں نہیں چاہتی کہ آپ بادشاہ بننے پر رضامند ہوں۔''

شہزادے نے حیرت سے مادام کی طرف دیکھا۔ مادام نے اپنی بات جاری رکھی۔ بولی''شہزادہ سلامت! یہ بڑے

بوڑھے ہم نوجوانوں کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ شہزادہ سلامت! میں جدید تعلیم سے آراستہ ہوں۔ مروجہ رسمی خیالات سے باغی ہوں۔''

حیرت سے شہزادے کی آنکھیں ابل آئیں۔ بولا'' پھر آپ نے میری اتالیق بننا کیوں منظور کیا؟''

مادام نے جواب دیا'' پیارے شہزادے! مجھے آپ سے بے پناہ ہمدردی ہے۔ آپ کو بڑے بوڑھوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ میں آپ کی اتالیق بن جاؤں۔''

شہزادے کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ تحسین جھلکی اور وہ سرک کر مادام کے قریب تر ہوگیا۔

تین مہینے بعد اخبارات کے پہلے صفحے پر سیاہ حاشیے کے اندر جلی حروف میں خبر چھپی کہ شاہ اسادا، شہزادہ ساجھانا اور ان کی اتالیق کے ہمراہ سیر و تفریح کے لیے ہل سٹیشن کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں اتفاقاً کار کا دروزہ کھل گیا۔ شاہ کار سے نیچے پھسل کر کھائی میں گر گئے۔ شاہ اسادا کی آخری وصیت کے مطابق اور عوام کے پُر زور مطالبے پر شہزادے ساجھانا اور ملکہ مادام زبوری کی تاجپوشی کی رسم سات دن کے سوگ کے بعد ادا کی جائے۔

☆☆☆

# حضرت مریمؑ صدیقہ بنتِ عمران

(ترجمہ) اے پیغمبرؐ وہ وقت یاد کیجئے جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا۔ اے مریم اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر (سورۃ آل عمران)

## خاندان:

بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد اور زاہد شخص تھے اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت محبوب و مقبول تھے۔

عمران حضرت سلیمانؑ کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنتِ فاقوذ بھی حضرت داؤدؑ کی نسل سے ہیں۔

عمران صاحب اولاد نہیں تھے اور انکی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے ہاں اولاد ہو وہ اولاد کے لئے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا اور قبولیت دعا کے لئے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ اپنے مکان کے صحن میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچے کو پھرا رہا ہے حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالتِ اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کچھیا ہاتھ اٹھا دیے اور عرض کیا ''پروردگا اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔'' دل سے نکلی ہوئی دعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت حاصل ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ھیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کچھیا وقف کر دوں گی۔

دعا کو شرفِ قبولیت ملنے کے بعد وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ امید برآنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔

## حضرت مریمؑ کی ولادت:

جب حمل کی مدت پوری ہو گئی اور ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کچھیا یہ لڑکی لڑکے سے کم نہ تھی مگر انہوں نے جو نذر مان رکھی تھی اس کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئیں کہ شاید اب ان کی نذر پوری نہ ہو سکے گی کیونکہ لڑکی کیسے مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو قبول کیا اور اسکی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا۔

## نام:

حنہ نے اپنی بیٹی کا نام ''مریم'' رکھا سریانی زبان میں مریم کے معنیٰ ''خادم'' کے ہیں۔ چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کچھیا وقف کر دی گئی تھیں اس لئے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کو سورۃ آل عمران میں اسطرح پیش کیا گیا ہے۔ ''وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا: خدایا میں

نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا تو کہنے لگی پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں اور میں نے اسکا نام مریم رکھا ہے اور میں اسکو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں پس مریم کو اسکے پرودگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اسکی نشوونما بہت اچھے طریقے سے کی اور ذکریاؑ کو اسکا نگرانِ کار بنادیا۔''

حضرت مریمؑ جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت ذکریاؑ سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ حضرت مریمؑ کی خالہ ایشاع کے شوہر تھے اور مقدس ہیکل کے کاہن اور اللہ کے نبی بھی تھے۔ اس لئے سب سے پہلے انہوں نے اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کرلیا جائے اور بقول روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ ذکریاؑ کا ہی نام نکلتا۔ کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں حضرت ذکریاؑ کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انہوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا۔ اسطرح حضرت مریم کی کفالت حضرت ذکریاؑ کے سپرد کردی گئی۔

### نذرِ ہیکل:

حضرت مریمؑ نذر ہیکل ہوچکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لئے ضروری تھا کہ وہ کسی مرد کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔ حضرت ذکریاؑ نے ان کے صنفی احترامات کا بہت خیال رکھا انہوں نے ہیکل کے قریب ہی ایک حجرہ ان کے لئے مخصوص کردیا کہ وہ دن میں وہاں جا کر عبادت الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں۔

### مریمؑ کا زہد وتقویٰ واطاعت گزاری:۔

مریمؑ شب وروز عبادت الٰہی میں مشغول رہتیں اور ساتھ ہی ساتھ خدمت ہیکل بھی انجام دیتیں حتیٰ کہ ان کا زہد وتقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا لوگ ان کی زہادت اور عبادت کی مثالیں دینے لگے۔ حدیث ابن جریر میں ہے حضرت مجاہد فرماتے ہیں حضرت مریمؑ نماز میں اتنا لمبا قیام کرتیں کہ دونوں ٹخنوں پر ورم چڑھ جاتا حضرت ابوزاعی فرماتے ہیں مریمؑ اپنے عبادت خانے میں اس قدر بکثرت اور باخشوع اور لمبی نمازیں پڑھا کرتی تھیں کہ دونوں پیروں میں زرد پانی اتر آتا۔

## حضرت مریمؑ، خدیجہؓ، عائشہؓ اور آسیہ زوجہ فرعون کی فضلیت:۔

مریمؑ کو فرشتوں نے خبر پہنچائی کہ اللہ نے انہیں انکی عبادت کی کثرت، دنیا کی بے رغبتی، انکی شرافت اور شیطانی وسوسوں کی دوری کی وجہ سے اپنے قرب خاص کا درجہ عنایت فرمادیا ہے اور تمام جہانوں کی عورتوں پر انہیں خاص فضلیت عطا کی ہے۔

بخاری شریف میں ایک حدیث شریف ہے رسولؐ نے فرمایا ''مردوں میں کامل مرد بہت سے ہیں لیکن عورتوں میں کمال والی عورتیں صرف تین ہیں۔ مریمؑ بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون اور خدیجہؓ بنتِ خویلد اور عائشہؓ کی فضلیت عورتوں

پر ایسی ہے جیسے ثرید یعنی گوشت کے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی کی تمام کھانوں پر۔''

**حضرت مریمؑ کے معجزات:۔**

حضرت زکریاؑ ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لے جایا کرتے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوت کدہ میں داخل ہوتے تو مریمؑ کے پاس بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے۔ آخر زکریاؑ سے رہا نہ گیا اور انہوں نے دریافت فرمایا۔ مریمؑ یہ تیرے پاس بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں۔ مریمؑ نے فرمایا یہ میرے پرودگار کا فضل وکرم ہے وہ جس کو چاہتا ہے بےگمان رزق دیتا ہے۔ حضرت ذکریاؑ نے جب یہ سنا تو سمجھ گئے کہ خدائے بزرگ وبرتر کے ہاں مریمؑ کا کیا خاص مقام ومرتبہ ہے، ساتھ ہی بے موسم کے تازہ پھلوں نے ان کے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کئے ہیں وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل بیٹا عطا نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر انہوں نے خشوع خضوع سے بارگاہ الٰہی میں دعا کی اور وہاں سے شرف قبولیت کا مژدہ عطا ہوا۔

مریمؑ اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کے سب سے مقدس مجاور حضرت ذکریاؑ بھی ان کے زہد وتقویٰ سے بہت متاثر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالت وقدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ ان کو برگزیدہ بارگاہ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سنائی۔ ''اور دنیا کی عورتوں پر مجھے بزرگی دی۔''

حضرت مریمؑ تقویٰ وطہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو اللہ کی طرف سے ان کی تقدیس وتطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بہ حقدار رسید کا مصداق ہے۔

**حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش:**

یہ خوش خبری حضرت مریمؑ کو فرشتوں نے سنائی کہ انہیں ایک لڑکا ہوگا۔ بڑی شان والا جو صرف اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کن'' کے کہنے سے ہوگا اور پھر ایسے ہی ہوا۔ ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کے فرشتے جبرائیلؑ انسانی شکل میں ظاہر ہوئے۔ حضرت مریمؑ نے ایک اجنبی کو اسطرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں ''اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں'' فرشتے نے کہا ''مریم! خوف نہ کھا میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں۔'' حضرت مریمؑ نے یہ سنا تو ازراہ تعجب فرمانے لگیں ''میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا اس لئے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ ہی میں زانیہ ہوں۔'' فرشتے نے جواب دیا ''میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں اس نے مجھے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اسی لئے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات گچھیا اپنی قدرت کاملہ کے اعجاز کا ''نشان'' بنادوں گا اور لڑکا میری جانب سے ''رحمت'' ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔''

سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں اس معجزانہ واقعات کا اسطرح بیان ہے۔ ''وہ وقت قابل ذکر ہے جب فرشتوں نے مریمؑ سے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔''

جبرائیل امینؑ نے مریمؑ کو یہ بشارت سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اسطرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریمؑ نے کچھ عرصہ تک خود کو حاملہ محسوس کیا تو ان کے اندر اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی اور یہ خیال کلیجہ مسوسنے لگا کہ میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ لاکھ اپنی برأت پیش کروں لیکن اس انوکھی بات کو کون مانے گا۔ اسی گھبراہٹ میں آپ تھیں کسی سے یہ واقعہ بیان نہیں کیا تھا۔ ہاں جب اپنی خالہ حضرت زکریاؑ کی بیوی کے پاس گئیں تو وہ آپ سے معانقہ کرنے کے بعد کہنےلگیں بچی اللہ کی قدرت اور تمہارے خالو کی دعا سے میں اس عمر میں حاملہ ہوگئی ہوں۔ آپؑ نے فرمایا خالہ جان! میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا اور میں بھی اپنے تیئں اسی حالت میں پاتی ہوں۔ چونکہ یہ نبی کا گھرانہ تھا اور ایشاع قدرت الٰہی پر اور صداقتِ مریم پر ایمان لے آئیں۔ اب یہ ہوا کہ جب بھی وہ دونوں پاک عورتیں ملاقات کرتیں تو خالہ صاحبہ یہ محسوس کرتیں کہ گویا ان کا بچہ بھانجی کے بچے کے سامنے جھکتا ہے اور اسکی عزت کرتا ہے۔

نوٹ (پہلے مذاہب میں دوسرے کے سامنے جھکنا جائز تھا اسی وجہ سے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اور آپ کے والد نے آپؑ کو سجدہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن شریعت محمدی میں یہ تعظیم اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہوگئی اور کسی بھی دوسرے انسان کے سامنے جھکنا اور سجدہ کرنا حرام ہوگیا)

یوسف نجار جن کے بارے میں قرین قیاس ہے کہ وہ مریمؑ کے ماموں زاد بھائی تھے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مسجد کے ایک اور خادم تھے۔ انہوں نے جب مریمؑ کا یہ حال دیکھا تو دل میں شک سا پیدا ہوا۔ انہوں نے تحقیقات کیں تو مریمؑ نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ جب ولادت کا وقت آیا تو انہوں نے سوچا اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ قوم حقیقت حال سے واقف نہیں ہے اس لئے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لئے مناسب ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کو وہ سراۃ (سامیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب ''بیت اللحم'' کے نام سے مشہور ہے۔ معراج کے واقعہ کے بیان میں بھی ایک حدیث گزری ہے جس میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی جگہ ''بیت اللحم'' تھا۔

جب دردزہ شروع ہوا تو آپ موت کی تمنا کرنے لگیں وہ جانتی تھیں کہ کوئی انہیں سچا نہ کہے گا ان کے بیان کردہ واقعہ کو من گھڑت سمجھے گا۔ دنیا آپ کو پریشان کردے گی اور عبادت واطمینان میں خلل پڑے گا۔ ہر شخص برائی سے یاد کرے گا۔ لوگوں پر برا اثر پڑے گا تو فرمانے لگیں کاش میں اس حالت سے پہلے ہی اٹھا لی جاتی بلکہ کاش میں پیدا ہی نہ کی جاتی۔ اسقدر شرم وحیا دامن گیر ہوئی کہ آپ نے اس تکلیف پر موت کو ترجیح دی اور تمنا کی کہ کاش کہ میں کھوئی ہوئی اور یاد سے اتری ہوئی چیز ہو جاتی کہ نہ کوئی یاد کرے اور نہ ہی ڈھونڈے نہ ذکر کرے۔

اس مشکل وقت میں نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پکارا مریمؑ غمگین نہ ہو تیرے پرودگار نے تیرے لئے تیرے نیچے ایک نہر جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچے کے نظارے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج وغم کو بھول جا۔

حضرت مریمؑ پر تنہائی، تکلیف اور نزاکت حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰؑ جیسے برگزیدہ بچے کے نظارے سے کافور ہو گیا۔ اور

وہ عیسیٰؑ کو دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگر چہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاکدامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جاسکے گا کہ بن باپ کے کس طرح بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔

مگر جس خدائے بزرگ و برتر نے ان کو یہ بزرگی بخشی وہ کب ان کو اس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا۔ اس لئے اس نے فرشتے کے ذریعے مریمؑ کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے انکو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اس لئے آج کسی سے بات نہیں کرسکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچے سے پوچھ لو تب تیرا رب اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر کر کے انکی حیرت کو دور اور ان کے قلوب کو مطمئن کردیگا۔ حضرت مریمؑ ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے کر بیت المقدس کو روانہ ہوئیں۔ جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے مریمؑ یہ کیا؟ اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریمؑ نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے۔ اس سے معلوم کرلو میں آج روزہ سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب سے کہا ہم کس طرح اس شیر خوار بچے سے بات کرسکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے مگر بچہ فوراً بول اٹھا ''میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے اپنے فیصلہ تقدیر میں مجھ کو کتاب ''انجیل'' دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا ہے۔ کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور خودسر اور نافرمان نہیں بنایا اور اسکی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔''

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کے منہ سے یہ حکیمانہ کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہوگیا کہ مریمؑ کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک ''نشان'' ہے۔

یہ خبر نہ ایسی تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی۔ قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زدہ واقعہ اور عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے کروٹیں بدلنی شروع کردیں۔ اصحاب خیر نے اسکے وجود کو اگر یمن وسعادت کا مہتاب سمجھا تو اصحاب شر نے اس کی ہستی کو اپنے لئے فال بد جانا اور بغض وحسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کردیا۔

غرض اس متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تا کہ اسکے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیاتِ تازہ بخشے۔

**بشارات ولادت:۔**

اسرائیلیت کے مشہور ناقل حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو اسی شب فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا۔ بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملک شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا

کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات وواقعات معلوم کریں۔ وفد جب شام پہنچا تو اس نے تفتیش حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کواس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ یہودیوں نے اہل فارس کی زبانی جب یہ کلمات سنے تو اپنے بادشاہ ھیرودیس کوخبر کی۔ ہیرودیس یہ سب حالات سن کرگھبرا گیا۔ادھر وفد کے کچھ لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا۔صبح کو وفد کے لوگوں نے ہیرودیس سے ملنے کا ارادہ ترک کردیا اور حضرت مریمؑ سے مل کر اپنا خواب سنایا اور کہا معلوم ہوتا ہے ہیرودیس کی نیت خراب ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ تم اسے ایسی جگہ پر لے جا کر پرورش کرو جو علاقہ ہیرودیس کی دسترس سے باہر ہو۔ اس مشورہ کے بعد حضرت مریمؑ یسوع مسیح کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں جب حضرت عیسیٰؑ کی عمر مبارک تیرہ برس کی ہوئی تو انہیں لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔

**وفات:**

حضرت مریمؑ کی وفات کے بارے میں قرآن اور انجیل دونوں خاموش ہیں۔ عیسائیوں کی ایک روایت کے مطابق حضرت مریمؑ نے اپنے منہ بولے بیٹے جان کے ساتھ اپنی بقایا زندگی گزاری اور انہی کے پاس وفات پائی۔

نوٹ:۔اس مضمون کی تیاری کیلئےتفسیر ابن کثیر،قصص القرآن
ازمولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔مکمل قصص الانبیاء،
مولانا عبدالعزیز ہزاروی،انٹرنیٹ سے استفادہ کیا گیا

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

# گنبد خضریٰ کے سامنے

جب سینہ چھلنی تھا، آنکھوں میں برسات اور زبان گُنگ......ایک روحانی تجربے کی روداد

مسجد نبوی کے مشرقی جانب ایک ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد ہم تینوں ماں بیٹیاں مسجد کی طرف جانے کو سڑک کنارے کھڑی تھیں، جہاں اور بھی نمازی اسی انتظار میں تھے کہ کب ''شرطہ'' ان کے لئے راستہ بنا کر دیتا ہے۔ سڑک پار کر کے ایک خالی میدان میں سے گزر رہے تھے تو تاشفہ نے میرا ہاتھ زور سے دبایا، خوشی جس میں استعجاب کا رنگ نمایاں تھا۔

''امی، امی! وہ دیکھیں،'' دوسرے ہاتھ سے اُس نے اشارہ کیا۔

میں نے اور ہانیہ رحمٰن نے بیک وقت ادھر دیکھا۔

**اللهم صلی علی سیدنا محمد وبارك وسلم۔**

گنبد خضریٰ پہ نظر پڑتے ہی فاصلے سمٹ گئے اور میں پل بھر میں ان فضاؤں میں پہنچ گئی جہاں سیرت کی کتابوں نے پہنچنا ہمارے لئے آسان کر دیا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان سب سیرت نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔ تاریخ نویسوں، محدثین کچھیا عقیدت بھری دُعا کی۔ انہی کی بدولت مومنوں کے دلوں میں ان فضاؤں کی خوشبو رچ بس جاتی ہے۔ گنبد خضریٰ کے ساتھ کیا ایمانی تروتازگی وابستہ ہے اس کی وضاحت بہت مشکل ہے۔ مسلمانوں کی کیمسٹری ایسی ہے۔ یہ ایمان کی حلاوت ہے یا محبت کا کرشمہ کہ یہاں کے میدانوں، پہاڑوں کے ساتھ ہماری جذباتی وابستگی مسلم ہے۔

اپنی سوچوں میں گم تھی کہ سامنے جنت البقیع نظر آنے لگا۔ دنیا کے سارے شہرِ خموشاں کا بادشاہ شہرِ خموشاں۔

میں نے ہانیہ اور تاشفہ کے ساتھ مل کر دُعا کی۔ السلام علیکم۔

**یغفرالله لناولکم۔انتم سابقون وانا انشاء الله بکم لاحقون۔**

ہزاروں صحابہ کرامؓ یہاں آرام فرما رہے ہیں۔جلیل القدر صحابہ، امہات المومنین، رسولؐ اللہ کی بیٹیاں۔ پیارے نبیؐ کی اپنی بیٹیوں سے محبت کا احساس میری آنکھیں نم کرنے لگا۔ میں نے دونوں کو دائیں بائیں اپنے پہلو سے لگا لیا اور دونوں کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

میرے نبیؐ کی سنت ہے بیٹیوں سے پیار کرنا! جنت البقیع کی دیوار کے پاس کھڑے میں آنسو بہاتی رہی۔ میں بھی بیٹی ہوں۔ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ بیٹیوں سے میرے حبیبؐ کو کتنا لگاؤ تھا۔ مجھے بھی ہے، میرے ماں باپ کو بھی تھا۔ یہ سب اسی لئے تو تھا کہ نسبت انؐ سے جا ملتی ہے۔ یہ نسبتیں بھی کتنا حوصلہ دلاتی ہیں۔ کتنا قرب، اپنائیت عطا کر دیتی ہیں۔ بیٹیوں کے حوالے سے میری نسبت پیارے نبیؐ سے یہ بھی تو ہے کہ میری بھی چار بیٹیاں ہیں۔ اے اللہ میری بیٹیاں سیرت میں ان بیٹیوں جیسی ہوں، جنت میں ان کے ساتھ ہوں۔ میں نے تصّور میں ان چاروں کو ان

چاروں کے ساتھ بیٹھے دیکھا...... جنت کے اعلیٰ درجات میں...... پیار کی اک نئی لہر نے شادکردیا۔ہمیں بیٹیاں اس لئے پیاری ہیں کہ آقا کی تعلیم وتربیت یہی سکھاتی ہے۔

نماز کے لئے آتے جاتے ان جنت البقیع کے باسی ان خوش نصیبوں سے ''سلام دُعا''ضرور ہوتی۔ ہر مرتبہ دل کسی قیدی پرندے کی مانند پھڑ پھڑانے لگتا۔

''وانا انشاءاللہ بکم لاحقون''

سلام پیش کرنے کے بعد میں دلِ مجبور کو سمجھاتی اور وہ مجھے سمجھانے لگتا۔ ہر مرتبہ آتے جاتے اس وسیع وعریض شہر خموشاں پہ نگاہ ڈال کر اپنی جگہ کی درخواست پیش کردیتی۔ یہی نگاہ پلٹ کرآتی تو زیرزمین ''قیمتی خزانوں'' کے قریب، بہت قریب،بس دیوار کے پار...... دنیا کے خزانے مومنوں کی آزمائش کو موجود پاتی ایک نگاہ کے پیچھے کتنے دَور نظر آتے ہیں،اوراسی پلٹتی نگاہ کے ساتھ کتنے منظر بدل جاتے ہیں۔

میں سوچتی یہ بازار یہ راستے اور یہ دکانوں کی جگہیں اسی راستے سے تو حضوراکرمؐ کا گزر ہوتا ہوگا۔ مجھے اُنؐ کی قدموں کی چاپ سانسوں کی مہک فضا میں محسوس ہونے لگی۔ جنت البقیع اور حجرہ عائشہؓ کے درمیان کا راستہ......ایک ایسی یاد سے وابستہ ہے جو مجھ ہمیشہ مسکرانے پر مجبور کرتی ہے اور میں خود کو اُسی ماحول کا حصّہ محسوس کرتی ہوں۔

آدھی رات کا وقت جب میرے پیارے نبیؐ آہستگی اور خاموشی سے گھر سے نکلے اور چھپ چھپا کے، محبت کا سمندر سینے میں موجزن لئے حضرت عائشہؓ پیچھا کرتی ہوئی......میاں کے ساتھ بیوی کی محبت کا لازوال جذبہ...... دومقام کا درمیانی راستہ جو میں نے ہمیشہ مسکراتے جذبات کے ساتھ طے کیا، دیکھا اور محسوس کیا۔

اُس ایک دن یہ احساسات اتنے غالب آئے کہ میں گنبد خضریٰ کو نگاہ میں سموتے ہوئے باب جبرائیلِ کے سامنے والے صحن میں بیٹھ گئی۔ یہاں سے حضوراکرمؐ گزرے ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ کیسے چھپتی چھپاتی جاتی ہوں گی۔ ساری بیویوں کے جذبات ایک جیسے ہوتے ہیں۔میاں سے دوری سب کو شاق گزرتی ہے۔ ہر بیوی شک کرتی ہے۔ محبت کا نرالا انداز ہوتا ہے یہ! دماغ میں یہ بات آئی کہ اگر یہ شک محبت کی وجہ سے ہے تو قابل گرفت تو نہ ہوا۔ میری نگاہ بے اختیار گنبد خضریٰ پہ جا ٹکی۔ اگر حضرت عائشہؓ کی یہ بے تابی،تجسّس اللہ تعالیٰ کو بُرا لگتا تو فوراً گرفت ہوتی۔ یہ تو ایک سادہ سی بات ہے میاں بیوی کی محبت میں ......نہ حضورؐ نے ناراضگی کا اظہار کیا نہ کوئی وحی اتری کہ رات کے اس پہر اکیلی شوہر کی ٹوہ لگانے کیوں نکلی؟ شوہر بھی وہ جو حبیبؐ خدا اور انسانِ کاملؐ ہو۔قوامیت کے پیش نظر شوہر کے بارے میں فکرمندی کی یہ بات اکثر وبیشتر میرے لئے سوالیہ نشان بنی رہتی تھی۔ پھر شارجہ کی ''مسجد نور'' میں ایک جمعہ کو نماز گچھیا ہم سب گھر والے گئے تو خطیب صاحب نے اس موضوع پہ بہت خوبصورتی سے وضاحت کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ شوہر کے معمولات پہ نگاہ رکھنا قابل گرفت نہیں ہے، اور انہوں نے اسی واقعہ کی مثال دی (اُس دن نہ جانے کتنی بیویاں نہال ہوئی ہوں گی میری طرح) نماز کے بعد گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

''آپ نے سنا خطیب صاحب کیا کہہ رہے تھے''میرے شوہر بہت ذہین ہیں میرا مدّعا سمجھ گئے۔ کچھ جارحانہ سے انداز میں کہنے لگے۔

''سارے خطبے میں تمہیں یہی بات سمجھ آئی ہے بس؟''

''آپ کو کیا بات سمجھ آئی؟'' میں نے سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں''، تجاہل عارفانہ میں لپٹا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ ''کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔'' آج اس جگہ پر ان خطیب صاحب کو دُعا دینا بھی میرا فرض تھا۔ اب میرے احساسات اور اس واقعہ کی جذباتیت میں انوکھا پن بھی شامل تھا۔ کاش! شوہر جانتے ہوتے کہ بیوی کی محبت میں جو فکرمندی ہوتی ہے اس کو کھو کر وہ کیا چیز کھو بیٹھتے ہیں۔

میں نے اپنے خیالات کو جھٹکا اور سامنے دیکھا باب جبرئیل کھلا ہوا تھا اور دور سے مواجہ شریف میں کھڑے زائرین نظر آرہے تھے۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں پھر سے حجرہ عائشہؓ اور جنت البقیع کے درمیانی راستے کو ناپا اور تصور میں خود کو آس پاس ہی پایا۔ جب رات کا وقت تھا اور حضرت عائشہؓ چادر اوڑھے دل میں محبت کا سمندر موجزن لیے اپنے محبوب کا پیچھا کر رہی تھیں۔ محبوب بھی وہ جس کو آبگینوں کی نزاکت کا بھرپور احساس تھا۔

لوگوں کی آمدورفت میرے اردگرد جاری تھی۔ ظہر کی اذان میں ابھی کچھ وقت تھا۔ ہلکے ہلکے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدت کم تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ صحن میں لگے جہازی سائز کے چھاتے بھی دھوپ کو روک رہے تھے۔ آج دونوں بچیاں ابھی گھر میں تھیں۔ فجر کی نماز کے بعد عموماً زائرین اپنے ٹھکانوں پر جا کر آرام کرتے اور ظہر کچھیا مسجد میں آجاتے ۔ رمضان المبارک کی ساعتیں ہوں اور مسجد نبوی (جو کہ اب نبوی دور کے پورے مدینہ منورہ پر محیط ہے) تو مومنوں کے دل ایسے موجیں مار رہے ہوتے ہیں جیسے چودھویں کا چاند ہو اور سمندر کی موجیں۔ وہاں بیٹھے حرب الاعظم پڑھی جس میں ساری مسنون دعائیں درج ہیں۔

پھر درود شریف کا ورد کرتی رہی۔ ظہر کی نماز کے لئے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے میں بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باب علی تک پہنچ گئی۔ ٹھنڈک اور پرسکون ہوائیں دور سے محسوس ہونے لگتی ہیں۔ پوری مسجد نبوی میں برابر ایک جیسی ٹھنڈک رہتی ہے۔ رمضان المبارک کی وجہ سے دن بھر خواتین مسجد میں ہی رہتیں۔ آرام کرنے کا بھی موقع دیا جاتا ہے۔ ہم بھی ایک بار آجاتے تو تراویح پڑھ کر ہی گھر جاتے۔ رات کو دیر سے کھانا کھاتے، وہیں سحری ہو جاتی اور تہجد کے وقت حرم شریف میں آجاتے۔ افطاری بھی حرم شریف میں کھجور، دہی اور روٹی سے کروادی جاتی۔ اس افطاری میں وہ لذت، طاقت اور برکت ہوتی کہ پھر تراویح کے بعد رات کا کھانا اور سحری کو جمع کر لیتے۔

رات کو ہم چاروں مل کر کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ بچوں کے لئے بروسٹ کھانا ترجیح ہوتا جو ہمارے گھر اور مسجد نبوی کے درمیان ہی پڑتا تھا۔ بہت پرسکون شب وروز گزرتے ہیں۔ حرمین شریفین میں زندگی میں وقت کی پابندی کے ساتھ رہنا اور محبت اہل صفا سے نور وحضور وسرور بھی مل جاتا ہے۔ اضافی دنیاوی جھنجھٹ سے آزاد ...... نہ پکانا پڑے نہ جا کر لانا پڑے۔

الحمدللہ میرے شوہر بہت اچھے ہیں اور سفر میں، گھر سے باہر اور بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم اہل خانہ گھر سے باہر بہت اچھا وقت گزارتے ہیں اور اگر وہ سفر حجاز ہو تو نورٌ علیٰ نور۔ اللہ تعالیٰ میرے شوہر کو صحت وایمان کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے۔ ان کی وجہ سے ہمیں بار بار یہ خوش نصیبی حاصل ہو جاتی ہے اور انہی کے وسیلے سے ابتدائی بارہ سال کا عرصہ سعودیہ میں گزارا جو میری زندگی کا سنہری دور ہے۔

وہاں بچوں کے ساتھ مسجد میں رہنے سے بہت کچھ سیکھا اور سکھایا۔ ماحول، جگہ دل کی کیفیات مختلف ہوتی

تھیں۔ جو کچھ پورا سال نہ کہہ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔سیرت نبویؐ، تاریخ، سیرتِ صحابہؓ وصحابیاتؓ، واقعات کو سنانا، غور کرنا، نتیجہ نکالنا، عمل کی راہ تلاش کرنا، وعدے کرنا، دُعائیں، زیارتیں کرنا......سب کچھ بچوں کی محبت میں اضافہ کا باعث بنا۔ سیرت کی کتاب محمدؐ عربی یہاں پڑھنے سے ان جگہوں کا احساس، قرب وتعلق میں اضافے کا باعث بنا۔ یہ مقدس مقامات ایسے ہیں کہ زندگی میں جتنی مرتبہ بھی حاضری ہو، ہر مرتبہنیا مشاہدہ، نیا تجربہ اور سکونِ تازہ کا احساس ملتا ہے۔آنکھوں کوطراوٹ دل کوتقویت......ایمان میں استقامت کا جذبہ زیادہ ہوجاتا ہے۔

شارجہ سے عمرہ کی نیت سے روانہ ہوئے تو ارادہ تھا کہ دس بارہ دنوں میں لوٹ آئیں گے۔لیکن یہ میرے رب کریم کی خاص عنایت رہی کہ ہم ایک دن، ایک دن کر کے تقریباً تین ہفتے وہاں گزار آئے۔ جب واپسی کا ارادہ ہوتا تو لگتا، کہیں سے آواز آرہی ہے،

''اتنی جلدی کیا ہے جانے کی، ابھی رکو نا!''

اور میرا رب روک ہی لیتا۔اسی طرح مدینہ منورہ میں کچھ محبت بھری ناقابل فہم سی آوازیں دامن پکڑلیتیں اور روح جھوم جھوم جاتی۔ہم شہرِخموشاں کے باسیوں سے سلام دعا کرتے اور گنبد خضریٰ کی ٹھنڈک سے آنکھیں طراوٹ محسوس کرتیں۔

اُس دن تہجد کے وقت مسجد نبویؐ کی طرف جاتے ہوئے میں نے دونوں بچیوں سے کہا''آج ہم اکیلے اکیلے بیٹھیں گے۔''

''کیوں امی'' تاشفہ نے چونک کر پوچھا

''کیا ہم آپکو تنگ کرتی ہیں۔'' ہانیہ نے معصومیت سے میری جانب دیکھا۔

''نہیں! یہ بھی تجربہ کرکے دیکھو۔طواف اور سعی بھی تو خود کفیل ہوکر کی ہے نا تم دونوں نے۔''

دونوں کی طرف سے خاموشی رہی۔ میں نے سوچا میں دل کی بات کہہ دوں کہ''اصل میں مجھے کسی سے خاص طور پر ملنا ہے۔اکیلے میں۔''

''کس سے؟'' دونوں نے بیک وقت سوال کیا۔

''بس بہت سے پیغام اور باتیں ہیں جو ضروری ہیں۔'' میں جب سے آئی تھی وہ موقع تلاش کررہی تھی۔ میرے اوپر جب بھی رقت طاری ہوتی، دونوں بچیاں مجھے ہراساں سی ہوکر دیکھنے لگتیں۔

بچوں کے لئے ماں کا رونا بہت ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ مائیں تو پھر بھی بچوں کا رونا برداشت کرتی ہی ہیں۔ بچے ماں کی روتی آنکھوں کو برداشت نہیں کرسکتے، وجہ چاہے کچھ بھی ہورونے کی۔

دل آہ وفغاں، روح الحاح وزاری کرنا چاہتی تھی۔ ایسے کہ کسی کوکسی کا دھیان نہ رہے۔کوئی کسی سے تڑپنے کی وجہ دریافت نہ کرے......کسی کو ہمدردنگاہوں سے نہ دیکھے کہ یہاں ہمدردی کا مفہوم آنسو پونچھنا نہیں ہوتا۔ بلکہ جن کی آنکھیں خشک رہتی ہیں وہ ہمدردی کے قابل ہوتے ہیں۔

روح جس پانی سے غسل کرتی ہے وہ آنسو ہوتے ہیں۔ یہ پانی کا چشمہ کوشش سے کبھی دریافت نہیں ہوتا۔ یہ خدائی چشمہ جب پھوٹتا ہے تو پھر بے اختیار بہتا چلا جاتا ہے۔انسان کی چشم سے بہنے والا چشمہ انمول ہے۔ اس کا ہر قطرہ قیمتی ہے اگر وہ ندامت سے نکلا ہو۔ ایسا ایک قطرہ بھی نارجہنم کو بجھانے کی طاقت رکھتا ہے۔انسان کے پاس یہی دولت ہے جس کا بدل کچھ نہیں۔کوئی لفظ، کوئی جملہ، کوئی آہ، کوئی قیمت، کوئی ہتھیار اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں چشمۂ چشم خشک ہی نہ ہو جائے۔ جب آنسوؤں کی زبان میں بات کرنے کا موقع آئے تو وہ گنگ نہ ہو جائے۔

ریاض الجنتہ کی طرف جانے کے لئے منتظر خواتین جالی کے دروازوں سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انتظامیہ زبان جاننے والوں کے گروپ بنا رہی تھیں۔ عائشہ خاتون پاکستانی خواتین کو توحید کے بارے میں درس دے رہی تھیں۔ انتظامیہ کی طرف سے ہدایات دی جا رہی تھیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ خواتین نظم وضبط کا مظاہرہ کریں۔ مگر کچھ مزاجوں کی بے صبری اور کچھ محبت کا جذبہ اور پھر اطاعت کا قرینہ نہ ہونے کی وجہ سے مثالی نظم وضبط عنقا ہوتا ہے۔

دروازے کھلتے ہی اک شور سا مچ گیا۔ جنت کے دروازے جب کھلیں گے تو تب بھی ایسا ہی ہوگا؟ بے قراری......ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا شوق۔ میرے دل نے مجھے سرزنش کی۔

"جب اور جہاں آگے بڑھنے میں سبقت کا حکم ہے وہ یاد نہیں رہتا۔"

"جنت کے دروازے تو کشادگی کا بے مثال مظہر ہوں گے۔ سکون، اطمینان، وقار، تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہوگا، اعلیٰ درجے کے انسان ہوں گے۔"

میں نے قدموں کو نپے تلے انداز میں رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے جنت کے دروازوں کا تصور باندھا۔

"ہوں گے تو وہاں ہم جیسے۔ دنیا کے جھمیلوں میں پھنسے انسان ہی...... جو یہاں مہذب ہوگا۔ وہاں بھی ہوگا......تو پھر تہذیب سیکھنی تو اسی دنیا میں ہے۔" یہی سوچتے میں نے اپنے اردگرد بھاگتی ہوئی بہنوں کو دیکھا۔ "محبت ہے نا!" میرے اندر سے کسی نے سرگوشی کی اور "محبت میں سب کچھ......" اور اک ٹھوکا سا میرے دماغ میں اٹھتی سوچوں پہ لگا۔

"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"

اور میں محبت کے پہلے قرینے کی انگلی پکڑ کر "سبز قالینوں" کا تصور کر کے اس کے قریب ترین صحن کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

سامنے ہی تو گنبد خضریٰ کی بہار جلوہ گر تھی!

"اے اللہ! میں درود وسلام کے اتنے تحفے بارگاہِ نبیؐ میں پیش کرتی ہوں جتنے آپ خود پسند کریں اور جن سے آپ راضی ہو جائیں۔" بچپن میں یاد کی ہوئی دعا لبوں پر خود بخود جاری ہو گئی۔

**اللھم انی اسلك العفو والعافیه**......زبان یہاں آ کر اٹک گئی۔ اندر سے ایک سرگوشی جیسا سوال چبھنے لگا......تیرِ نیم کش جیسا......عافیہ صدیقی؟

ہاں! وہ بھی......اے اللہ ہمیں عافیہ صدیقی بھی واپس چاہیے۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں مگر پھر بھی کس قدر مضبوط رشتہ ہے......جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نسبت ہے اور جس رشتے میں اللہ کے نام کی ڈوری بندھی ہو کیا وہ کمزور ہو سکتا ہے؟

عافیہ کی شکوہ کناں مظلوم صورت میرے دل کو چھیدنے لگی اور آنکھوں میں برسات کا موسم چھا گیا۔

عافیہ کی زندگی، عزت وآبرو سے بے نیاز یہ اربوں مسلمان اور ان کے بے حس حکمران، وہ امت کی بیٹی جس کا نام ماں نے "عافیہ" رکھا اب "عافیت" سے ناواقف ہے۔ وہ کتنے مسلمانوں کی......کس کس کی شکایت کرے گی؟ وہ جس کو اس کے خواب میں حضورؐ نے "بیٹی" کہہ کر

مخاطب کیا۔ ایک بیٹی جب باپ سے کسی کی شکایت کرتی ہے تو باپ کیوں مداوا نہ کرے!

میرے تصور نے وہ منظر دکھایا کہ میری روح کانپ اٹھی۔ بے اختیار میری آہ نکلی۔ ایک التجا......ایک گزارش۔

''عافیہ! عافیہ! میری بہن میں تجھ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ خدا کے لئے میری شکایت پیارے نبیؐ سے نہ کرنا۔ میں عافیت کی دعا کرتے ہوئے کبھی تمہیں نہیں بھولی۔'' میں نے عافیہ کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''خدا کے لئے تم میری شکایت پیارے نبیؐ سے نہ کرنا۔ ہر نماز میں ،طواف میں، گھر میں، گھر سے باہر...... ہر جگہ، ہر دعا میں تمہارا حصہ ہے۔''

''یا میرے مولا! ہمارے حال پر رحم فرما۔ امت کی بیٹی اور سب بیٹیوں پر کرم کی نظر کر دے۔ عافیہ کو عافیت سے ہمکنار کر دے۔''

دعا جب لفظوں کی محتاج نہ رہے تو پھر آنکھوں کی برسات مدّعا بیان کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ دل کے اندر رقت کا چشمہ ابل ابل کر چشمان کے راستے بہہ رہا تھا۔ پتہ نہیں غم دل کو کھا رہا تھا یا دل غم کو کھا رہا تھا۔ یا دونوں کام ساتھ ہی ہو رہے تھے۔

وہی طائف کے سفر کا دکھ چپکے سے درآتا ہے اور میرے دکھی دل کو اور بھی غم زدہ کر دیتا ہے۔ میں جب بھی دکھی ہوتی ہوں، پیارے نبیؐ کا وہ سفر اور ان کی زبان سے نکلے لفظ یاد آنے لگتے ہیں۔ شاید اس پکار، اس التجا کو اللہ تعالیٰ یاد کروا دیتے ہیں تا کہ پھر سکون اور ٹھہراؤ آجائے جسم و جان میں۔

''اے اللہ! تو میری بات سن رہا ہے۔ میری جگہ اور مقام سے واقف ہے۔ میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ میری کوئی بات تجھ سے چھپی نہیں ہے۔ میں سختی میں مبتلا ہوں، محتاج ہوں، فریاد کناں ہوں، پناہ کی طلبگار ہوں۔ اپنے گناہوں کا اعتراف ہے گڑگڑا رہی ہوں۔ ذلیل مجرم کی طرح سے پکارتی ہوں اسی طرح جیسے ایک مصیبت زدہ پکارتا ہے اور اس کی طرح التجا کرتی ہوں جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، آنسو رواں ہوں، جس کا جسم تیرے سامنے عاجز ہو کر پڑا ہوا اور غلام کی ناک اپنے آقا کے سامنے خاک آلود ہو......

اے اللہ! میری اس التجا کو قبولیت سے محروم نہ کرنا۔ میرے لئے مہربان اور رحیم ہو جانا۔ اے بہترین عطا کرنے والے اور سائل کو بہترین جواب دینے والے......

اے اللہ! میں عافیہ کی کمزوری کا گلہ، اسکی بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اس کی ذلت کی شکایت تیرے سامنے پیش کرتی ہوں۔ اے ارحم الرحمین، تو عافیہ کو کس کے حوالے کریگا، اس دشمن کے جو اس سے ظالمانہ رویہ رکھے گا۔ یا کسی دوست کے ہاتھ میں دے گا اس کا فیصلہ......اے اللہ! اگر تو اس سے ناراض نہ ہو تو اس کو کسی مشکل کی پروا نہیں ہے۔ مگر پھر بھی تجھ سے ہم عافیت کے طلبگار ہیں......

اے اللہ! حفاظت فرما...... جیسے کہ تو ایک شیر خوار بچے کی حفاظت فرماتا ہے۔'' آمین۔

اور میں نے سارا وقت عافیہ کے لئے، اپنے قلبی احساسات کو اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچانے میں گزار دیا۔

☆☆☆

# چلتے چلتے

قارئینِ کرام کو رمضان المبارک کی پر بہار ساعتیں مبارک ہوں۔ ساتھ ہی آزادیٔ وطن کی مبارک بھی قبول فرمائیں جسے حاصل تو جان جوکھوں میں ڈال کر کیا تھا مگر اس آزادی کو برتنے کا ہمیں سلیقہ نہ آیا۔ یا ہمارے حکمرانوں نے سلیقہ آنے نہ دیا۔ اور آج نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ آزاد ہوتے ہوتے بھی گوڈے گوڈے دلدلِ غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں اور احساسِ زیاں تو دور کی بات اُلٹا احساس تفاخر ہے یہی وجہ ہے کہ سو جوتے بھی کھاتے ہیں اور سو پیاز بھی کھاتے ہیں پھر بھی مسکراتے ہیں اور اپنے ''بہترین فیصلوں'' بودے دلائل کے انبار لگاتے ہیں اور قوم کو بیوقوف بناتے ہیں جبکہ قوم اب اتنی بھی بے وقوف نہیں رہی۔

ہر کس و ناکس کی یہ آواز ہے
آج کی سرکار کھلے باز ہے
ہر طرف گڑبڑ ، گھٹالے ، لوٹ مار
کیا سہانے دور کا آغاز ہے
اس کے آگے جھک رہا ہے اقتدار
جس کو عیاری پہ اپنی ناز ہے

اب دیکھ لیجئے اقتدار کے جھکنے کی تازہ ترین مثال! کہ گیلانی صاحب کے سدھارنے کے بعد وزارت عظمیٰ کا تاج کس کے سر سجا ہے؟ جی ہاں راجہ پرویز اشرف صاحب کے سر، عرف رینٹل پاور کیس گویا پی پی پی صاف شفاف، بے داغ اور با کردار شخصیات کے لحاظ سے بانجھ ہو چکی ہے۔

یوں راجہ صاحب پہ اندھوں میں کانا راجہ والی کہاوت کیسی صحیح بیٹھتی ہے۔ گیلانی صاحب نے ''شاندار حکومت'' کرنے میں کسر چھوڑی تھی کہ جو پرویز ثانی تشریف لے آئے ہیں مشرف نہ سہی اشرف سہی۔ میم نہ سہی۔ الف سہی۔ موت نہ سہی، اذیت سہی۔ ویسے آفرین ہے زرداری صاحب پہ بھی۔ ایسے ایسے بزرجمہر احباب سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اور باری باری انہیں اقتدار کے ہنڈولے میں بٹھاتے جاتے ہیں کہ جاتے جاتے ایک، ایک، دو، دو ماہ سہی وزیراعظم کی تہمت اپنے سر دھرتے چلیں اور وزیراعظم ہاؤس میں رہائش کا سواد مستو چلیں۔ اب پرویز اشرف صاحب کو سپریم کورٹ نے 25 جولائی کی تاریخ دے دی ہے۔ خط لکھنے کی۔ یہ خط لکھنا بھی ان دنوں ایک سیاپا سا سیاپا ہے محبان زرداری گھیا۔ ایک مرزا غالب تھے خط لکھنے کے اس قدر شوقین کہ

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

کہہ کر خطوں کے انبار لگا دیتے جو آج تک خطوط غالب کے نام سے محفوظ ہیں ادھر ہمارے وزیراعظم صاحبان ہیں کہ خط لکھنے کے نام سے ان کے پر جلتے ہیں۔ چنانچہ کرسی جائے تو جائے پر چٹھی نہ لکھی جائے۔ گیلانی صاحب نے یہی تو کیا اور اب فوزیہ بے چاری ملتان میں بیٹھی خشک آنکھوں سے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہونگی اور بے آواز چیخ رہی ہوں گی بلکہ کُر لا کُر لا کر کہہ رہی ہوں گی کہ

گیلانی
وے اک تیری ہٹ بدلے

ہتھوں کھس گئی دنیا سہانی

مگراب پچھتائے کیا ہوت۔ جب راجہ چگ گیا کھیت

خیر ہمیں کیا۔ خط لکھنے والے جانیں۔ خط لکھوانے والے جانیں اور خط پڑھنے والے جانیں۔ ہم تو چلتے ہیں ''چلتے چلتے'' کی طرف اور ہاں! چلتے چلتے یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ آپ کا یہ کالم چلتے چلتے ساتویں برس میں داخل ہوگیا ہے۔ الحمدللہ۔ وماتوفیقی الاباللہ۔

امریکی ریاست ایری زونا سے تو پہلی خبر پڑھیئے!

ہوم ورک نہ کرنے پر بہانے بازی میں اول آنے پر طالبہ کو تباہی ایوارڈ دیا گیا۔ آٹھ سالہ کینڈرا گارشیا کی والدہ کا کہنا ہے کہ ''میری بیٹی کو تباہی ایوارڈ دے کراس کی توہین کی گئی ہے نیز یہ ایک ظالمانہ فعل ہے۔''

ہوم ورک میں بہانے بازی کرنے پر تباہی ایوارڈ! تو پھر ہمارے گیلانی صاحب کس ایوارڈ کے مستحق ٹھہرے ہیں جنہوں نے سپریم کورٹ کے ساتھ بہانے بازی کی ساری حدیں مکادیں۔ مشرف صاحب کے گلے میں کون سا ایوارڈ ڈالیں جنہوں نے ایک فون کال پر نکی جئی ہاں کر کے پوری قوم کی عزت ، غیرت اور وقار وسلامتی کی نفی کردی۔ ذرا اور پیچھے جایئے بھٹو صاحب کے بند کوٹ کے کالر پر کونسا تمغہ سجایا جائے کہ جنہوں نے ادھر ہم ادھر تم کہہ کر وطن عزیز کو دولخت کردیا۔ اور سپریم کورٹ سے پھانسی کی سزا پا کر شہید بن گئے۔ چہ خوب!

بےنظیر کے دونوں دور کیسے بےنظیر رہے، یہ سب جانتے ہیں اور پھر ان کا سرتاج جو قوم کے گلے کا کانٹوں کا ہار بن گیا ہے۔ وہ سب پہ بھاری جارہا ہے۔ آخر ہے جو زرداری۔

؎ غربت ، اذیت ، ملامت ، کرپشن
تیرے عہد میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

ملک کے وسیع تر مفاد میں نیٹو سپلائی بحال کی گئی۔ نیٹو سپلائی کی بحالی کے حوالے سے امریکہ کے ساتھ کوئی خفیہ معاہدہ نہیں کیا گیا: وزیر اطلاعات کائرہ۔ نیٹو سپلائی کی بحالی۔ نیت اپنی کالی۔ نفاق کی راہ اپنالی۔ کمزوری ایمان دکھادی اب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں مرغانِ گلشن اقتدار۔ کبھی ملک وقوم کا وسیع تر مفاد بتا رہے ہیں کبھی ساری دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتے کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ اللہ کے بندو! کہاں کا ملک اور کیسی قوم، اور کس کا مفاد۔؟ ملک وقوم کا مفاد عزیز ہوتا تو آپ کے یہ کارنامے ہوتے؟ یہ جو سیاست کو بازیچہ اطفال بنا رکھا ہے تو یہ ملک وقوم کے مفاد ہی میں کیا جارہا ہے؟ رپورٹس آرہی ہیں کہ روزانہ اربوں کے حساب سے کرپشن ہورہی ہے۔ یہ بھی مفاد ہی ہے ملک وقوم کا۔ لاکھوں بےروزگار۔ کروڑوں بھوک اور خوف سے لاچار، ڈاکے ہر شہر میں بےشمار، یہ ملک وقوم کا مفاد ہی تو ہے، یہ نیٹو سپلائی میں ملک وقوم کا مفاد۔ آخر کیا معنی رکھتا ہے سوائے اہل دل کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے۔ ارے عقل کے اندھو! اپنے مفادات کی گانٹھ کے پورو! مسلمان کا خون بہانے کے لئے مشرکوں کو راہداری دے رہے ہو۔ سپلائی بحال کررہے ہو پھر بھی ملک وقوم کا مفاد عزیز ہونے کی نوید سنا رہے ہو۔ تمہارا پیش کردہ تازہ ترین وزیر اعظم تو اندھوں میں کانا راجہ ہوسکتا ہے ساری قوم تو کانی، بہری یا اندھی نہیں ہے۔ اس رب قادر مطلق سے ڈرو جس نے کافروں کو دوست بنانے سے منع کیا ہے مگر تمہارے دلوں میں تو یہی کافر بسے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے ہوں یا بھارت کے۔ اگر ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں فیصلہ فرمایا ہے تو یہ آپ صاحبان کے اپنے مفادات کیا ہوئے؟ خیر یہ بصیرت، یہ محبت (ملک وقوم سے) یہ عجلت، یہ ذلت مبارک ہو حکمرانوں کو

؎ مسلمانوں کی جانوں کے عوض پیسہ مبارک ہو
حمیت اور غیرت کا ہوا سودا، مبارک ہو

اسی کو دہر میں دریا دلی سے یاد کرتے ہیں
کہ بیچا حریت کو کس قدر سستا، مبارک ہو
فقط سوری پہ فوری ہوگئی جاری جو سپلائی
یقیناً سوچا سمجھا تھا یہ منصوبہ، مبارک ہو

''توہین عدالت سینٹ سے بھی منظور۔قومی اسمبلی پہلے ہی منظور کر چکی تھی۔تحفظات کا اظہار کرنے والے حکومتی ارکان میں رضا ربانی، اعتزاز احسن اور ق لیگ کے مشاہد حسین شامل ہیں۔''

کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ مستقبل کا مورخ جب عہد زرداری کی تاریخ رقم کرے گا تو اس ''شاندار حکومت'' کو کن الفاظ میں یاد کرے گا؟ ایسے ایسے سنگ میل نصب کر رہے ہیں یہ ذہین و فطین حکمران کہ میٹرک یا مڈل پاس طالبعلم بھی ان کے ملک وقوم کے'' وسیع تر مفاد''میں اٹھائے گئے اقدامات پر حیران و پریشان ہوجاتا ہے۔عدلیہ کے ساتھ حیلے بازی کے بعداب نوبت کھلی محاذ آرائی تک آن پہنچی ہے۔

آئین مین ترمیم کرنے چلے ہیں یہ شاہزادے کہ صدر، وزیر اعظم، چاروں صوبوں کے وزیر اعلیٰ و گورنرز صاحبان نیز وزیر وغیرہ توہینِ عدالت سے مشنیٰ ہیں۔گویا ایوان عدل کو اپنے گھر کی لونڈی بنانے چلے ہیں۔ کیا بات ہے ان شاہزادوں کی۔ایسی سوچ تو بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں کو بھی نہ سوجھی۔ وہ لوگ بھی کاضی وقت کے حضور حاضر ہوا کرتے تھے۔ دوہری شہریت حاصل کرتے ہوئے ان کی وفاداری کا حلف اٹھائیں گے تو پھر پاکستان کی سالمیت کا دفاع کیسے کریں گے؟ مگر شاید پاکستان کا دفاع مقصود ہی نہ ہو۔اگر مقصود ہوتا تو یہ گل کھلاتے؟ آپ کے اپنے یہ ارکان، آپ کے وفادار ارکان اس بل پر تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں۔محسوس یوں ہوتا ہے جیسے ہزیمت، شرمندگی، ناکامی آپ کا مقدر ہے۔ نہ جانے کس کس طرح اور کہاں کہاں کے تیر تفنگ اکٹھے کر کے عدلیہ کی طرف پھینکتے ہیں مگر الٹا وہ آپ کی طرف پلٹ آتا ہے۔ ہائے ری قسمت۔سوئس کیس۔ ملک ریاض کیس، توہین عدالت بل اور دہری شہریت بل۔اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ آپ یہی ذہانت، دولت وقت قوم کی بھلائی پہ لگاتے تو شاید کوئی چار بندے آپ کو دعا دے ہی دیتے مگر آپ کا تو معاملہ ہی عجیب ہے۔حکومت کیا ملی اہل وطن کا جینا ہی دوبھر کر دیا۔ جناب نے۔نہ دین کا رہنے دیا اور نہ دنیا کا۔

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص

''افغانستان دوسرا ویت نام بن گیا۔۵ کھرب ڈالر خرچ کرنے کے باوجود امریکی قربانیاں رائیگاں لگتی ہیں: امریکی اخبار شکاگو ٹربیون''

قربانیاں؟ وہ بھی امریکی قربانیاں؟ کچھ دل کو لگتی نہیں ہے۔ہاں یوں کہتے تو بات کچھ بن جاتی کہ ۵ کھرب ڈالر خرچ کرنے کے باوجود طالبان پر قابو نہیں پا سکے یا مجاہدین کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے۔ ویسے مجاہدین تو گھاٹے میں رہتے ہی نہیں کبھی۔ جو بچ گئے وہ غازی اور جو کام آ گئے تو شہید۔سب فاتحین سے بڑا فاتح۔ فی الفور جنت میں داخلہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے مزے۔ناکامی اور نار جہنمی تو کفار کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ذرا اپنے وسائل دیکھئے، ڈالروں کی ریل پیل دیکھئے، اتحادی ممالک کی فوج ظفر موج دیکھئے۔ ڈرون حملوں میں گھرے بے وسیلہ مجاہدین کو دیکھئے ہاں مگر رب العزیز تو ہے ان کے ساتھ اور جب وہ ذات ساتھ ہو تو غم کا ہے کا۔

غم تو امریکی افواج کو کرنا چاہیے اور کرتے بھی ہیں ڈیلی میل کے مطابق ہر ماہ ۵۰۰ برطانوی فوجی ذہنی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ امریکہ کا ۵ کھرب تو کیا ان شاء اللہ ہزاروں کھرب ڈالر بھی بیکار جائیں گے جب بھی کسی مظلوم، بے قصور فرد یا قوم کو ظلم کی چکی میں پیسا جائے گا تو قانون قدرت اسی

طرح حرکت میں آئے گا۔ ابھی تو آگے آگے نہ جانے کس طرح کے انتقام لے گی قدرت۔ امریکی فوجیوں کی وحشت و دیوانگی و درانداگی تو عروج پر ہے۔ وہ پاک خون، وہ عظیم مجاہد جو کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اللہ کی سر زمین پر اللہ کا نظام چلنا چاہیے ان کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے گانے گاتے ہیں۔ تم انسان ہو یا آدم خور جنگلی؟

''بیوی کو 10 سال تک زنجیروں میں جکڑ کر رکھنے والا امریکی گرفتار''

لیجئے! مہذب قوم کے ایک مہذب فرد کا ایک اور کرتوت ملاحظہ فرمائیے۔ گرفتار کر کے بھی کیا کریں گے آخر؟ تھوڑی بہت سزا یا پھر ذہنی مریض قرار دے کر معاملہ رفع دفع۔ یہی واقعہ ہمارے ہاں ہوا ہوتا اور کوئی مسلمان شوہر اپنی بدکردار بیوی کو 10 سال تو کیا دس دن بھی زنجیروں میں جکڑے رکھتا تو یہی امریکہ اور اس کی پروردہ ڈالر مارکہ این جی اوز آسمان سر پر اٹھا لیتیں یہاں تو جھوٹ موٹ کی کہانیاں گھڑ کر ویڈیو یا فلم تیار کر کے مسلم معاشرے کی رسوائی کا سامان اس طرح کیا جاتا ہے کہ یہ کارنامہ انجام دینے والوں کو سر پر اٹھایا جاتا ہے۔ ایوارڈ دیئے جاتے ہیں اور پاکستان اور اسلام کو جگہ جگہ بدنام کیا جاتا ہے۔ اب ذرا اس امریکی کے ظلم و ستم کی بھی دستاویزی فلم بنائیں تو ہم جانیں۔ اتنی سی بات بھی ان کوتاہ عقل، مادر پدر آزاد خواتین کو سمجھ نہیں آتی کہ اغیار آپ کی مہارت اور لیاقت پر تو کم ہی ایوارڈ دیتے ہیں وہ تو پاکستان یا اسلام کو بدنام کرنے کے ''مقدس فریضے'' پر آپ کو نوازتے ہیں۔

میں شکار ہوں کسی اور کا مجھے مارتا کوئی اور ہے
مجھے جس نے بکری بنا دیا وہ تو بھیڑیا کوئی اور ہے
وہ جو پھینٹ پھینٹ کر پھٹ گیا میں پھٹا ہوا وہی تاش ہوں
مجھے کھیلتا کوئی اور ہے، مجھے پھینٹتا کوئی اور ہے

''نیٹو کی سپلائی پر بات ختم نہیں ہوجاتی۔ پاکستان میں موجود دہشت گردوں سے نمٹنے کچھیا بہت کچھ کرنا ہے۔ نواز شریف اور عمران خان نے یقین دلایا ہے کہ وہ مکمل طور پر امریکہ کے حامی ہیں: کیمرون منٹر''

اور سن لیں۔ وطن عزیز میں نیٹو سپلائی کی بحالی پر لے دے ہو رہی ہے۔ دفاع پاکستان کونسل ہزاروں لاکھوں محبان وطن کے ساتھ کامیاب لانگ مارچ ہر صوبے میں کر رہی ہے اور وڈی سرکار کا سابق سفیر کیسے پوپلے منہ سے فرما رہا ہے کہ پاکستان کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جی ہاں! پاکستان کو فی الواقعی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہاں سے آپکا ڈیرہ ڈنڈا اٹھانا ہے۔ نکال باہر کرنا ہے۔ پھر اپنے حکمرانوں کو سیدھی راہ پر لانا ہے۔ قیام پاکستان کے مقصدِ وحید کو اسی سر زمین پر لاگو کر کے ان لاکھوں شہیدوں کے سامنے سرخرو ہونا ہے جنہوں نے پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ کہہ کے سوز دروں میں ڈوب کر اپنا سب کچھ اس پر واردیا۔ ابھی بھارت سے بھی حساب چکانا ہے۔ کشمیر کی آزادی کا۔ ہمارے پانی پر قبضہ کر کے ہماری زراعت کی بربادی کا۔ امت مسلمہ کو ابھی متحد کرنے کا کام بھی باقی ہے۔ اسلامی بلاک کی قوت بڑھانا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ سچ کہتے ہو مسٹر منٹر! ابھی پاکستان کو بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی جو پاکستان امریکہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ساتھ ساتھ نہیں بلکہ دست بستہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے تو وجہ صرف یہی ہے کہ ہمیں حکمران ایسے ملے ہیں جو ایمان سے کہیں زیادہ ڈالر کو عزیز رکھتے ہیں۔ کاش! کوئی مردِ مجاہد اس قوم کو مل جائے تو پھر دیکھئے اس کی جولانیاں، اس کی رعنائیاں، اس کی تابانیاں۔ ہمارے موجودہ حکمران تو امریکی وزیر خارجہ کے محض سوری کہنے پر ہی جی جان سے نہال ہو گئے ہیں۔ کہاں بلند بانگ دعوے تھے کہاں مٹی کے باوے بن گئے۔

منٹر صاحب نے نواز شریف اور عمران خان کا بھی پول خوب کھول دیا ہے۔ اب یہ لاکھ وضاحتیں کرتے پھریں بات بن نہیں رہی۔ نواز شریف کو جاننے والے تو پہلے ہی ان کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار کب رہے ہیں لیکن اب تو انہوں نے خود امریکہ کی حمایت کی یقین دہانی کروائی ہے۔ اب کون سی پالیسیاں؟ وہی واجپائی کو بلا کر ''اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں'' کی یقین دہانی کروانا ہے انہیں؟ یا پھر بھارت جا کر فرمانا ہے کہ آپ بھی چاول کھاتے ہیں ہم بھی چاول کھاتے ہیں لہٰذا ہم ایک ہیں۔ کچھ اسی طرح کی گوہر افشانی فرمائی تھی انہوں نے پچھلے دنوں۔

ادھر سونامی صاحب نے کھمبا یوں نوچا ہے کہ ہم امریکہ کے نہیں اس کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ اگر ایسا ہے تو دفاع پاکستان کونسل کے لانگ مارچ میں کیوں نہیں شامل ہوئے یہ؟ قربان جایئے ایسے لیڈروں پر!

☆☆☆

شمیم فاطمہ

# کتنی گرد پڑتی ہے......!

خواتین کی بڑی تعداد صبح اٹھتے ہی صفائی پر کمربستہ ہوجاتی ہے اور کمر سے یہ بستہ تبھی اترتا ہے جب......

یوں تو دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہونے کے کئی اسباب ہیں لیکن یہ جو صفائی کا خبط ہے ناں وہ اکثر خواتین کے اعصاب سے بھوت بن کر چمٹ جاتا ہے جس کے باعث نہ وہ دن چین سے گزارتی ہیں نہ رات۔ وہ جب تک جاگتی رہتی ہیں یہی سوچتی رہتی ہیں کہ صفائی کہاں سے شروع کی جائے؟ کہاں کی صفائی ناگزیر ہے؟ صفائی کرلی جائے تو اسے برقرار کیسے رکھا جائے؟ (کیونکہ مہمانوں کی آمد تک ساری صفائی ستھرائی پر پانی پھر چکا ہوتا ہے) جب سونے کچھیالیٹتی ہیں تو یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ ''کل صفائی کرنی ہے!'' اور اس ٹینشن سے ان کی نیند اڑ جاتی ہے) اب آپ کے جی میں خیال آئے گا کہ ہم نیند اڑنے کا بنیادی سبب تو بتا ہی نہیں رہے ہیں۔ اب جو بات سارے زمانے کو پتہ ہو، پتے پتے، بوٹے بوٹے کو معلوم ہو اسے بتانے کی کیا ضرورت!! سنا ہے کہ پہلے اختر شماری صرف اہلِ عشق ہی کیا کرتے تھے باقی لوگ لمبی تان کر سویا کرتے تھے۔ اب لوڈشیڈنگ نے اہلِ دل، اہل ایمان، اہلِ عشق، اہلِ دماغ، اہلِ قلم اور اہلِ غم سب کو راتوں کی جگار کا عادی بنادیا ہے۔ اب لوگ کروٹ کروٹ kesc کو گالیاں اور کوسنے دیتے رہتے ہیں اور sms کرکر کے عزیزوں، دوستوں سے یہ پوچھتے رہتے ہیں کہ ''ہمارے یہاں لائٹ نہیں ہے، تمہارے یہاں ہے؟'' اس طرح حال احوال، دلوں کی بھڑاس، اِدھر اُدھر کے شکوے بھی بستر پر لیٹے لیٹے ہوجایا کرتے ہیں)

معلوم نہیں صفائی کا مالیخولیا کسی دماغی عارضے کا نام ہے یا نفسیاتی عارضے کا! مگر صفائی ہماری زندگیوں سے اسی طرح جڑی ہوتی ہے جیسے اقتدار سے ہوس جڑی ہوتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ صفائی کو نصف ایمان قرار دے کر ہم پر لازم نہ کرتے تو محکمہ صحت کو یہ اعلامیہ جاری کرنا پڑتا کہ صحت کی بقا کے لئے صفائی اختیار کیجئے! سو خواتین کی بڑی تعداد آنکھ کھلتے ہی صفائی پر کمربستہ ہوجاتی ہے (ان کی کمر سے یہ بستہ اسی وقت اُترتا ہے جب ان کی کمر دوہری ہوجاتی ہے اور دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہوجاتی ہے۔) چنانچہ کمروں کی صفائی، باورچی خانے کی صفائی (ویسے باروچی خانے کو اب کوئی دوسرا نام دے دینا چاہیے، کیونکہ پاکستان میں غریبوں کی تعداد ان گنے چنے امراء سے کئی گنا زیادہ ہے جو کھانا پکوانے کے لئے باورچی رکھنے کا استعداد رکھتے ہیں، ہرچند کہ اکثریت کو اقلیت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے مگر باورچی خانے کو باورچی خانہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے یہاں اقلیت کی بالادستی تسلیم شدہ ہے) یہ وہ کام ہے کہ اس کا کرنا ازبس ضروری ہے، کچن کی صفائی سے چشم پوشی کی جائے تو وہاں کاکروچ ایسے مٹرگشت کرتے نظر آئیں جیسے اسلام آباد میں امریکی جاسوس نظر آتے ہیں، کمروں کی صفائی سے نظریں چُرائی جائیں تو صبح شام تک کمرے کی وہ حالت ہوجائے کہ دیکھنے والوں کو ڈکیتی کی واردات کا گماں

گزرے۔(الماری ابلی ہوئی، کپڑے پھیلے ہوئے، چادر لٹکی ہوئی، کشن اور تکیے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے جیسے نقدی اور زیور کی تلاش میں ڈاکوؤں نے کمرے کا حلیہ بگاڑ دیا ہو)غسل خانے کی صفائی سے دو چار دن تساہل برتا جائے تو کائی، پھسلن، بدبو، پلاسٹک کے لوٹوں میں لعاب کی تہ(قدم رکھتے ہی جی چاہے کہ الٹے قدموں لوٹ جاؤ!) جو خواتین ملازمت یا ضعفِ صحت کے باعث خود صفائی کے خلجان میں مبتلا نہیں ہوتیں وہ ماسی رکھ کر اس سے بڑے خلجان میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور اس کام کے لئے انہیں نقد رقم بھی خرچ کرنی پڑتی ہے۔) صفائی اور خواتین کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نہ صفائی خواتین کے بغیر ممکن ہے نہ صفائی کے بغیر خواتین کی زندگی ممکن ہے۔

صفائی کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی خواتین لگا سکتی ہیں جو خود اپنے ہاتھوں سے صفائی کرتی ہیں صفائی کوئی دوسرا کرے تو ہمیں ہرگز نہیں بھاتی۔ ہمیں اس میں کیڑے ہی نظر آتے ہیں۔ کوئی کمی ہی نظر آتی ہے۔ ہمیں ہر کسی کی صفائی غیر تسلی بخش ہی لگتی ہے۔(ایسے کی جاتی ہے ڈسٹنگ...... ہونہہ! کمرے کی صفائی ہوگئی مگر چھت پر بدستور جالے لٹکے ہیں۔ کچن کی صفائی ہوئی ہے؟ چولہا اپنی بے نوری پر ماتم کناں ہے۔ باتھ روم کی صفائی ہوگئی ہے مگر...... یہ اماں جیسی عظیم ہستیاں وزیر ماحولیات بن کر نظروں ہی نظروں میں صفائی کا جائزہ لیتی رہتی ہیں اور وقفے وقفے سے گھر کتی رہتی ہیں۔) کچھ خواتین تو خشوع وخضوع سے صفائی کرتی ہیں کچھ چار و ناچار (جسطرح وہ زندگی کے دیگر امور چار و ناچار انجام دیتی ہیں جسطرح وہ بہت سے رشتے چار و ناچار نبھاتی ہیں) کچھ خواتین عادتاً صفائی کرتی ہیں (نہ کیا تو بہت برا ہوگا......) کہ صفائی کے بغیر کوئی چارہ نہیں (اس سے زیادہ معقول کام وہ کر ہی نہیں سکتیں!) کچھ اس لئے کرتی ہیں کہ وقتاً فوقتاً جو ''امتیاز'' اور ''میکرو'' سے ''کلینرز'' لالا کے جمع کرتی ہیں انہیں بھی ٹرائی کیا کرنا ہوتا ہے۔ غرضیکہ گھر کی صفائی ایک ایسا معمول ہے کہ آندھی ہو کہ طوفان، بیاہ ہو کہ بارات، پیر ہو کہ جمعرات...... صفائی کا ناغہ نہیں ہو سکتا۔ صبح ہوئی ناشتے سے نمٹے، صفائی میں جُتے۔

ہماری ایک دوست کا مایوں تھا، انہوں نے سوچا کہ مہمانوں کی آمد سے قبل گھر کی صفائی کر لی جائے، چنانچہ اسٹول پر چڑھ کر جالے صاف کر رہی تھیں کہ دفعتاً پاؤں ان کا پھسلا اور اڑا......ڑا......دھم! آئے ہائے مچ گئی (براوقت آہی گیا تھا سوٹلتا کیسے؟) ٹانگ پر پلستر چڑھا کر دلہن کو پارلر جانا پڑا۔ دلہن پر روپ تو ٹوٹ کر آیا مگر...... ہر دیکھنے والے کی نگاہوں میں ایک تاسف تھا اور لبوں پر آہ بچاری!...... دلہن کی اماں کہہ رہی تھیں کہ ''اس صفائی کے خبط نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا۔''

جہاد زندگانی میں صفائی عورتوں کی شمشیریں ہوا کرتی ہیں کبھی اس جہاد کے دوران ٹانگ ٹوٹتی ہے، کبھی مہرے کھسک جاتے ہیں، اس شہادت پر نہ نشانِ حیدر ملتا ہے، نہ تمغہ جرأت! خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ ''تم سے کس نے کہا تھا صفائی کرنے کو؟'' اور شہید ہونے والا اپنا سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔

؎ عشق میں سر پھوڑنا ہی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شیر کا!

ماحولیاتی کثافت میں روز مرہ اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ گرد و غبار ہ ہے کھڑکیوں، دروازوں، چلمنوں، چوباروں، فرنیچر، پردوں، قالینوں، کتابوں، ہاتھوں، پیروں سے لے

کر پھیپھڑوں تک کو آلودہ کیے دیتا ہے۔ ابھی آپ نے لکس سے جھاگ بنا بنا کر رگڑ رگڑ کے منہ دھویا ہے اور اس چاند سے مکھڑے کی بلائیں لیتی گھر سے باہر نکلی ہیں اور ذرا سی دیر میں پسینہ پونچھنے کے لئے جو ٹشو منہ پر پھیرتی ہیں تو...... میل کچیل دیکھ کر آپکو حیرت کا شدید جھٹکا لگتا ہے اور آپکو شبہ گزرتا ہے کہ آپ نے کسی اور منہ پر ٹشو رگڑا ہے (سو آپ فوری طور پر فیشل کے لئے اپنی بیوٹیشن سے ٹائم لیتی ہیں اور دل ہی دل میں حساب لگا کر حیران ہوتی رہتی ہیں کہ پچھلے ہفتے ہی تو فیشل کروایا تھا!) گھر کی صفائی کے لئے کلینز ز اور چہرے کی صفائی کے لئے کلنزنگ کریمیں مارکیٹ میں بکثرت دستیاب ہیں۔ ہم ہر روز صفائی کرتے ہیں، ہر روز گرد جم جاتی ہے۔ صبح صفائی کرو تو شام کو دوبارہ صفائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر شے غبار آلود ہو چکی ہے (یا شاید ہماری بصارت میں کوئی ایسا خلل واقع ہو گیا ہے کہ ہمیں ہر شے غبار آلود دکھائی دیتی ہے۔) چہرہ غبار آلود...... لہجہ غبار آلود...... دل غبار آلود...... دماغ غبار آلود...... تعلق غبار آلود...... خوراک غبار آلود...... لباس غبار آلود...... آنکھیں غبار آلود...... خواب غبار آلود...... تمنا غبار آلود...... مستقبل غبار آلود...... گھر کی دیواروں سے لے کر شہر کی رہگزاروں تک ایک دھول اڑتی نظر آتی ہے۔ یہ غبار، یہ دھول موج در موج، تہہ در تہہ، پے در پے جمتے چلے جاتے ہیں...... دل کا عرش ہو...... کمرے کا فرش ہو...... امید کا شجر ہو...... بھروسے کا شہر ہو...... خلوص کا کھٹولا ہو...... مان کا جھولا ہو...... سب غبار آلود ہو جاتے ہیں۔ ہم گھر کی دیواروں کو میلا کچیلا دیکھ کر جھٹ پٹ ان پر ڈسمپر کروا لیتے ہیں۔ کانسی کے برتنوں پر نم آلود ہواؤں نے سیاہی ملی ہم نے جھٹ قلعی کروا لئے۔ چاندی کے جھمکے جوں ہی اپنی آب و تاب کھو کر رقیب روسیاہ کی طرح ہوئے ہم جیولر کے پاس دوڑ پڑے۔ بھائی ذرا اس پر پالش کر دو۔ کپڑوں پر داغ دھبے لگ گئے تو سرف ایکسل سے رگڑ رگڑ کر اس وقت تک دھوتے رہے جب تک یہ داغ مٹ نہ گئے یا کم از کم مدھم نہ پڑ گئے۔ قالین پر جو داغ پڑے تو ساری مصروفیات التوا میں ڈال کر ہنگامی بنیادوں پر اس کی صفائی میں جت گئے۔ آنکھ کا کاجل جو پھیلا تو فوری ٹشو پیپر کی تلاش شروع ہو گئی۔ اپنی بھونڈی سی ناک پر بلیک ہیڈ نظر آتے ہی پارلر جانے کا ارادہ کر لیا۔ اب جو بیوٹیشن نے ہمارے منہ پر ملامتی خطبہ دیا تو ہم فوری اس بات پر ایمان لے آئے کہ ''جلد کی صحت اور رنگت برقرار رکھنے کے لئے مہینے میں کم از کم دو دفعہ فیشل از بس ضروری ہے۔'' ہم بازاروں میں مختلف النوع کلینز ڈھونڈتے پھرتے ہیں، کچھ جراثیم کش اسپرے تلاش کرتے ہیں۔ ایئر فریشنر خرید لاتے ہیں ہاتھ دھونے کے لئے ڈیٹول سوپ اور منہ دھونے کے لئے ''کلین اینڈ کلیئر'' لانے کی تاکید کرنا نہیں بھولتے۔

جب ہمارا ظاہر روز روز کے گرد و غبار سے آلودہ ہو جاتا ہے تو دلِ مومن میں سال بھر کی گردِ ملامت، غبارِ خاطر، کینہ کپٹ، زود رنجی و تشنہ کامی، محرومی و ناچاقی، ناشکری و بے صبری اور گناہوں کے گرد و غبار سے کس قدر خاک آلود گا! عید آنے سے پہلے ہم اپنے گھر کا کونہ کونہ صاف کرتے ہیں۔ لیکن ''دل'' جہاں خدا رہتا ہے، اسکی صفائی اور پاکیزگی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دل میں بغض و عناد بھرا ہو تو اسے نکال پھینکنے میں تساہل برتتے ہیں، اول تو اس کا خیال ہی نہیں آتا، اور آ بھی جائے تو ٹال دیتے ہیں۔ کسی کے لئے دل میں کینہ رکھ لیں تو یوں سینت کر رکھتے ہیں کہ جیسے بیٹی کو دیتے کے لئے اپنا زیور سینت کر رکھتے ہی۔ کسی کے لئے دل میں بیر رکھ کر یوں چھوڑ دیتے ہیں جیسے لوگ پرائز بونڈ خرید کر رکھ

چھوڑتے ہیں، جھوٹ بولنا ہمیں جائز لگتا ہے ہم اسے ہمیشہ مصلحت سمجھ کر بولتے ہیں، اس جھوٹ سے ہر چند کہ ہمارے دل کے رخسار پر چھائیاں پڑ جاتی ہیں۔ دوسروں کی دل شکنی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اور عبارت سے، اشارت سے، ادا سے ایسی چوٹ لگاتے ہیں کہ زخمی پانی بھی نہ مانگے۔

ہماری اس ادا سے دلِ عزیز پر فنگس لگ جاتا ہے۔ مکر وفریب اور حیلوں بہانوں کو ہم اپنی کامیابی کے لئے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان سے کام لئے بغیر ہمارا گزارہ کہاں ہوتا ہے؟ اس فعل سے ہمارے دل کی رعنائی کمہلا کر رہ جاتی ہے۔ کبھی ہم دل سے ناشکری کرتے ہیں کبھی زبان سے اس آہ کی تپش براہ راست ہمارے دل پر پڑتی ہے اور وہ جھلس کر رہ جاتا ہے کسی کو ستانا، کسی کو جلانا، کسی سے بدلہ لینا، کسی کو پتہ بتانا، کسی کو مزہ چکھانا ہمیں مرغوب ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اس معاملے میں کوتاہی برتنے کے بالکل قائل نہیں ہوتے چاہے ایسا کرنے سے ہمارا دل وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے۔

اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپکا دل ہر طرح کے گرد وغبار سے پاک ہوکر شیشے کی طرح جگمگا اٹھے تو دل کی تازگی، پاکیزگی اور طہارت کے لئے اسے توبہ کی اسٹیم دیجئے، استغفار سے اس کا مساج کیجئے، حسد، رقابت، بغض وعناد، قطع رحمی کے بلیک ہیڈز کو درگزری کی کلنزنگ کریم سے صاف کیجئے، آنسوؤں سے دل کو رگڑ رگڑ کر دھویئے۔ گھر، لباس اور چہرے کے ساتھ ساتھ دل کی تزئین وآرائش کر کے اسے بھی قابلِ دید بنا دیجئے کہ چہرہ تو سب دیکھتے ہیں، وہ ''دل'' دیکھتا ہے۔

☆☆☆

# اے صبح عید گھر کو سجاؤں تو کس طرح

27 رجب کو صبح کے تقریباً 5 بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ اتنی صبح فون پہ کون ہوگا بھلا؟ شاید امریکہ میں بسنے والے عزیزوں میں سے کسی کا ہو؟ یہ سوچتے سوچتے فون اٹھا لیا''فرزانہ چیمہ صاحبہ ہوں گی'' دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز تھی۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا''جی بول رہی ہوں۔''

''میں احمد بات کررہا ہوں ڈاکٹر نزہت اکرام کا بیٹا۔ بتانا آپکو یہ تھا کہ رات امی کا انتقال ہوگیا ہے۔ جنازے کے وقت کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا''

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔ کب اور کس وقت؟ میں ضرور آؤں گی۔''اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہ کہا گیا اور فون رکھ دیا دل میں اس سخت صدمے کی لہر سی اتر گئی۔ بیمار تو وہ برسوں سے تھیں مگر یوں اچانک چپ چاپ چل دیں گی؟ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ میرا ان سے رشتہ محض خلوص اور پیار کا تھا۔ ایک خوبصورت انسانی کردار کا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بہترین قلم کار کا تھا۔

بہن نزہت اکرام کو میں بہت دیر سے پڑھ رہی تھی۔ ان کا قلم بہت سلجھا ہوا، اصلاحی رنگ لئے ہوا تھا۔ شاعرہ بھی زبردست تھیں۔ لیکن ملاقات کا موقع نہ ملا تھا یہاں تک کہ ایک دن مدیرہ بتول آپا جان ثریا اسماء نے فون پر ان کے بارے میں کچھ معلومات دے کر میرے اندر کے شوق کو ہوا دی۔ اور یوں ایک دن میں ان کے در دولت پر حاضر تھی بس پھر کیا تھا باہمی خلوص کا رشتہ ایسا استوار ہوا کہ اب وہ اپنے انتقال کر جانے کے بعد بھی دل سے نہیں جاتیں۔ ان کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ زندگی بھر نہایت متحرک رہیں دو مضامین میں ماسٹر ایک میں پی ایچ ڈی کی سند یافتہ ایوارڈ یافتہ نزہت اکرام سے ایک طویل انٹرویو''بتول'' کے لئے بطور خاص میں نے ہی کیا۔ جو''شام وسحر سے کام لے'' کے عنوان سے شائع ہوکر قارئین سے ایسی داد پا گیا کہ قارئین کے اصرار پر چند مزید سوالات کے جوابات ان سے لئے گئے۔ اس طرح ان کی شخصیت کے کئی خوبصورت گوشے ہمارے سامنے آ گئے۔

بہت سال پہلے ایک دن وہ اچانک چلنے پھرنے سے معذور ہوگئیں مگر ان کی یہ معذوری کئی صحت مندوں کو بھی مات کئے رکھتی تھی۔ اپنے گھر کے ایک حصہ میں تعلیمی و دینی مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا سارا انتظام ،نگرانی، راشن، سٹاف کی تعیناتی اور تربیت ،والدین سے ملاقات وغیرہ،سب کچھ ہی کرتی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ قلم و کتاب سے خاص محبت۔ کتنے ہی رسائل واخبار تھے کہ جن میں ان کی تحریریں اکثر وبیشتر اشاعت پذیر ہوتی تھیں۔ کتابوں پر تبصرے اس کے علاوہ تحریریں،فون پر رابطے بحال رکھنا، استوار کرنا اس کے علاوہ تھا۔ عدالت میں ایک قانونی جنگ الگ لڑ رہی تھیں کہ کسی خدا فراموش نے انکی دو دکانوں پر قبضہ کررکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کینسر کا جان لیوا مرض الگ ان کی جان کا دشمن تھا۔

ان سب کے باجود ان کی شخصیت ایسی متوازن، ایسی جاذب نظر، ایسی پرخلوص تھی کہ بھلائے نہیں بھولتیں۔ میں اکثر وقت نکال کر ان سے ملنے جاتی۔ مہمان نواز ایسی تھیں کہ مہمان کے جانے سے پہلے ہی میز سجا کر انتظار میں بیٹھی ہوتیں۔ میرا دل چاہتا کہ انہیں ادبی شخصیات سے ملواتی رہوں۔ ان کا دل تو چاہتا ہوگا ادبی تقریبات میں شرکت کرنے کو مگر اب جا نہیں سکتیں۔ سوکئی لوگوں کو میں ان کے ہاں لے کر گئی۔ مثلاً باجی سلمٰی یاسمین نجمی، شگفتہ نقوی، آپا جی سعیدہ قطب، قانتہ رابعہ، ام عبد منیب، آسیہ راشد، نسرین سحرش اور اپنی سمدھن ڈاکٹر شگفتہ ظہیر وغیرہ۔ یہ سب لوگ بھی انہیں مل کر بہت متاثر ہوئے میری کتابوں پر تبصرے بڑی محبت سے کرتیں اور ''چلتے چلتے'' جب کتابی شکل میں آنے لگی تو میرے کہنے پر اس پر تعریف بھی بڑے تعلق خاطر سے لکھی۔ ماریہ کی شادی پر میری فرمائش پر ایک خوبصورت رخصتی لکھی اسی طرح بیٹے محمد علی کی شادی پر سہرا بڑا عمدہ لکھا، جس طرح بولنے کا انداز بڑا دل نشین تھا اسی طرح ان کی لکھائی بھی بڑی خوبصورت تھی۔ میرے ملنے، دیکھنے کے زمانے میں انہیں دین سے کافی لگاؤ رہا، ہوسکتا ہے کہ پہلے سے ہی پابند ارکان ہوں لیکن مجھے تو وہ بات لکھنی ہے جس کی میں شاہد ہوں۔ وہ پنجگانہ نماز کے علاوہ نفل نمازیں بھی ادا کیا کرتی تھیں۔ اکثر فون کرنے پر پتہ چلتا کہ اس وقت نماز پڑھ رہی ہیں، غالباً تہجد گزار بھی تھیں۔ اپنے رب سے ان کا تعلق مجھے ہمیشہ خاص ہی محسوس ہوا۔ کینسر جیسے مرض میں بغیر کسی علاج کے بظاہر سکون واطمینان کے ساتھ بستر پر بیٹھے رہنا۔ لکھتے رہنا، پڑھتے رہنا فون پر گفتگو کرتے رہنا۔ دوسرے کئی امور انجام دیتے رہنا عام انسان کے بس کی بات کہاں ہے بھلا؟ کوئی خاص روحانی طاقت ہی ان کے اندر تھی جو انہیں سنبھالا دیئے ہوئے تھی۔

میری ان کے ساتھ کئی نشستیں رہیں۔ بڑی پیاری یادیں تازہ کرتی رہیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے احمد کی پوری کہانی مجھے سنائی۔ پھر اپنے گھر کوٹرسٹ بنا دینے کا بتایا کہ میں نے اس گھر کوٹرسٹ کی شکل دے دی ہے تاکہ مدرسہ چلتا رہے۔ بیگم وحید قریشی کا محبت کے ساتھ ذکر کرتیں۔ بیگم افضل جن کے ہاں سے یہ مدرسہ ان کے ہاں منتقل ہوا تھا ان کے بارے میں بتاتیں، ''بتول'' کی تحریروں پر زبانی تبصرے کرتیں۔ مجھے یاد ہے کراچی کی بہن شمیم فاطمہ کے بارے میں انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ میں نے ٹیلی فون پر ان سے رابطہ رکھا ہوا ہے ان کی تحریر کی مداح تھیں۔ دوسروں کے بارے میں ان سے ہمیشہ اچھی بات ہی سنی، ان دنوں تھوڑا سماعت کا مسئلہ ہو رہا تھا چنانچہ تھوڑا اونچا بولتے ہوئے ان کے ساتھ خوب گپ شپ رہتی۔

میرے خیال میں وہ اپنے کلام کو جمع کر کے شائع نہیں کرواسکیں۔ جبکہ ان کا کلام ضرور شائع ہونا چاہیے وہ ایک پختہ کار شاعرہ تھیں۔ ان کا شعری وادبی سفر بچپن سے ہی شروع ہوگیا تھا ایک معروف علمی وادبی گھرانے کی سلطان زمان سولہ برس کی عمر میں ہی ایک ادبی وعلمی پرچہ نکال کر مدیرہ بن چکی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب نزہت کا قلمی نام اپنایا تو فی الواقع اپنے چاروں طرف نزہت ونکہت کی پھوار برسانے لگیں جب رفیق حیات کے طور پر محمد اکرم رانا نے ان کا ہاتھ تھاما جو خود بھی ایک صحافی اور علمی وادبی شخصیت تھے تو اللہ نے انہیں اکرام بھی بہت عطا کیا، ایسا اکرام کہ سسرال میں ساس نے بہو کی شخصیت کی جاذبیت کو محسوس کر کے برملا کہا کہ میرے گھر میں تو چانن (روشنی) ہوگیا ہے۔ اب بھی ان کے سسرالی رشتے داران کی بے پناہ قدر ومنزلت کرتے تھے کئی واقعات انہوں نے مجھے خود سنائے تھے۔

ناول ،افسانہ،حمد ،نعت،غزل،بچوں کا ادب غرض ہر کہیں ان کے قلم کی گرفت مضبوط تھی۔ماہنامہ ''سیارہ''نمبر 58(تازہ شمارہ)میں ڈاکٹر تزئین آفریدی کا بچوں کےادب کےحوالے سےڈاکٹرنزہت پرمضمون شائع ہوا ہے۔افسوس کہ ڈاکٹرنزہت اکرام اس شمارے کو نہ دیکھ سکیں کہ ان دنوں وہ بے ہوشی کے عالم میں تھیں اس شمارے میں ان کی نظم ''جشن بہاراں'' بھی شائع ہوئی ہے۔اس کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

آتش ہے چناروں میں برپا ایسا بھی چراغاں ہونے دو
خوں رنگ سماں ہے ہر جانب،یوں جشن بہاراں ہونے دو
منزل بھی ملی تبریک بھی لی،پھر کروٹ لے کر سو بھی گئے
ان نیند کے ماتے لوگوں کے تاریک شبستاں ہونے دو
مسلے غنچے،کاٹے ہیں شجر ، بے برگ و بار کئے گلشن
مالی کے اپنے ہاتھوں سے تاراج گلستاں ہونے دو
کیوں دوست نما دشمن سے ملے؟ کیوں ملّی غیرت کھو بیٹھے؟
اک حشر بپا ہے سینوں میں،اک حشر کا سامان ہونے دو

اتنی صلاحیتوں والی،پرخلوص وپروقار اور نہایت خوددار ڈاکٹر نزہت اکرام 27رجب کی شب(17جون2012)تقریباً ایک بجے کے قریب طویل آزمائش وآلام سے نجات پا کر دائمی جہان کی طرف چل دیں جہاں نہ کوئی غاصب ہوگا ان کی جائیداد پر قبضہ کرنے والا،نہ کوئی بیماری ہوگی،نہ کوئی دکھ ہوگا۔

میں بھاری دل کے ساتھ انکی قیام گاہ پر پہنچی۔ان کا اپنا کمرہ خالی تھا دریاں بچھی ہوئی تھیں اور خواتین ان گٹھلیوں پر ذکر الٰہی کررہی تھیں جو ان کی بہو سعدیہ ہر ایک خاتون کے آگے رکھ رہی تھیں میں نے سرہانے کھڑے ہو کر انہیں محبت سے دیکھا۔ان کے چہرے پر بیماری کے کوئی آثار نہ تھے۔بلکہ ایک چانن سا تھا۔

عیدالفطر کی آمد آمد ہے۔آج پانچ سے چھ سال پہلے کی عید کی بات ہے۔میں نے عید کی رات سوچا کہ صبح کس کی طرف جایا جائے کہ راحت کے ساتھ ساتھ اجر،ثواب کا باعث بھی بنے۔ایک دم ڈاکٹر نزہت اکرام کا خیال آیا کہ ان کے پاس جا کر ان کا دل بہلایا جائے۔فوراً فون پر اپنے آنے کی اطلاع کردی۔ظاہر ہے ان کی خوشی کا مجھے اندازہ تھا۔اب ہوا یوں کہ نکلتے نکلتے حسبِ معمول دیر ہوگئی،صبح بارش ہورہی تھی۔کچھ میرے کام کاج۔ان کا فون آگیا وہی شیریں لہجہ''ارے بھئی کہاں رہ گئیں؟اب تو شجر،حجر،سڑکیں راستے سب دھل دھلا گئے آپ کے استقبال کے لئے اب آ بھی جایئے۔''

جانے پر حیران وپریشان سی رہ گئی۔اپنے ہاتھ سے بریانی پکائی ہوئی تھی ساتھ اور بھی کئی لوازمات تھے۔

''ڈاکٹر نزہت!یہ سب آپ نے کیسے پکایا؟اور کیوں پکایا؟''

''بھئی!مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ایک دو لڑکیاں جو قریب ہی رہتی ہیں انہیں بلوالیا تھا۔چولہا میرے قریب کر دیا انہوں نے اور میں نے بستر پر بیٹھے بیٹھے یہ سب کچھ تیار کرلیا۔''

اب پھر عید آنے کو ہے اور میں سوچ رہی ہوں۔

اے صبح عید! گھر کو سجاؤں تو کس طرح
بچھڑے ہوؤں کی یاد میں آنکھیں اداس ہیں

☆☆☆

# اسرائیل آغاز سے انجام تک

مصنف : میر بابر مشتاق

صفحات 350، قیمت 390روپے

راحیل پبلی کیشنز اردو بازار کراچی

قارئین بتول کے لئے میر بابر مشتاق کا نام نیا نہیں ہے۔ گاہے گاہے ان کے تحقیقی و معلوماتی مضامین بتول کی زینت بنتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن سے سیرت کے موضوع پر اعزازی سند حاصل کر چکے ہیں۔ سائنس کا سفر، اسلام یورپ میں، محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان سمیت دیگر بہت سے اہم موضوعات پر کتب کے مصنف ہیں۔ ملکی اخبارات ورسائل کے علاوہ سہ روزہ دعوت دہلی میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان دنوں اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی میں بحیثیت لائبریرین فرائض انجام دے رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب ان کی تازہ تصنیف ہے۔ تیسری دنیا کے ایک مسلم ملک میں رہتے ہوئے جب ہم اپنے زوال کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ گلوبل گیم کے شاطروں کا تذکرہ ضرور آتا ہے، جو اسرائیل کے تحفظ کی خاطر پوری دنیا کو ایک بھیانک انجام کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ یہ کتاب اسرائیل کے ناجائز قیام اور اس کی بقا کی خاطر روا رکھے گئے تمام تر ظلم کے ساتھ ساتھ اس کے انجام کا بھی مژدہ سناتی ہے۔ کتاب کا آغاز ارض فلسطین کے تعارف اور اس کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ پھر صیہونی ریاست کے منصوبوں کے تحت اس پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضے کی تاریخ مختصراً درج کی گئی ہے۔ تب سے لے کر آج تک فلسطینی عوام پر یہودیوں کے روح فرسا مظالم، اسرائیل کے بین الاقوامی جرائم اور اس کے خطرناک ترین مسلم مخالف ایٹمی پروگرام کی تفاصیل کے ساتھ یہ معلومات بھی چشم کشا ہیں کہ اسرائیل عورتوں کی سمگلنگ کا سب سے بڑا اڈا اور عصمت فروشی کا عالمی مرکز بھی ہے۔

کتاب کے مختلف ابواب حماس کی جدوجہد، فریڈم فلوٹیلا، ریشل کوری اور فلسطین کی پرعزم خواتین کے بارے میں ہیں۔ آخری حصہ خصوصاً اہم ہے جس میں ''ویمن ان بلیک'' کا تذکرہ ہے یعنی وہ اسرائیلی عورتیں جو فلسطینیوں کی جدوجہد کا ساتھ دے رہی ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ نیز حق گو اور بے باک امریکی صحافی ہیلن تھامس کا دلچسپ تذکرہ ہے جس نے اسرائیل کی مخالفت کر کے سارے مغرب کی مخالفت مول لے لی۔

یہ کتاب نہ صرف اسرائیل اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں تاریخی حقائق پر مبنی ایک مکمل دستاویز ہے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اسرائیل کے ناجائز قیام اور انسانیت سوز مظالم کے بارے میں خود مغربی پریس ہی میں شائع ہونے والے بیانات اور مضامین کے حوالے منتخب کیے گئے ہیں جو حقیقتاً

اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ اسرائیل، امریکہ اور برطانیہ کا یہ شیطانی گٹھ جوڑ زیادہ عرصہ تک ساری دنیا کو دھوکہ نہیں دے پائے گا۔ بلکہ خود ان کی اپنی صفوں میں سے اس جھوٹ کا پردہ چاک کرنے والے نکلتے آئیں گے جو بالآخر اس شیطانی کھیل کو انجام تک پہنچانے کا باعث بنیں گے۔ انشاءاللہ

☆☆☆

# پتھروں کی بستی میں

زندگی کے کسی نہ کسی چوراہے پہ ہمارے اعمال کھڑے ہمارے منتظر ہوتے ہیں۔ ماضی حال سے ملتا ضرور ہے جلد نہ سہی بدیر سہی......

اُنکے چہرے پہ جھریوں کا بہت باریک جال تھا۔ سر پہ چاندی بکھری ہوئی تھی۔ ہاتھوں کی رگیں باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ وہ ستر، اسی سالہ ایک کمزور سے بزرگ تھے۔ انکی سائیکل پہ گندم کی دو بھاری بوریاں لدی ہوئی تھیں، ایک پیچھے کیریر پہ اور ایک سائیکل کی کاٹھی پہ......اور وہ خود ایک ہاتھ بوری پہ رکھے ہوئے دوسرے سے سائیکل کا ہینڈل سنبھالے اسے بدقت تمام گھسیٹ رہے تھے۔ آگ برساتے سورج تلے انکا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔

سڑک کنارے کھڑے نوجوانوں کا ایک ٹولہ گپیں لگانے میں مشغول تھا۔ بیس بائیس سالہ طاقتور نوجوان اپنے سامنے بے تاثر نگاہوں سے، ایک کمزور بوڑھے کو بوجھ تلے دبا دیکھ رہے تھے۔ کسی کو بھی اتنی زحمت گوارا نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر ان بزرگ کا بوجھ بانٹ لے۔ انہیں منزل تک پہنچانے میں مدد کرے۔ بے حسی کی ایک موٹی چادر تھی جو وہاں ٹھہرے نوجوانوں نے اوڑھ رکھی تھی۔ یہ پڑھے لکھے معاشرے کے پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ یہ مستقبل کے معمار تھے۔ جنہیں آج قائد دیکھیں تو شرمندگی سے نگاہیں جھکاتے ہوئے اپنا قول واپس لے لیں۔ یہ ''اقبال کے شاہین'' تھے۔ جن سے اگر آج شاعر مشرق کا ٹکراؤ ہوتو وہ اپنی تشبیہات واستعارات بدل ڈالیں......

وہاں سڑک کے دونوں اطراف میں بہت سے خوانچہ فروش اپنی ریڑھیاں لگائے کھڑے تھے۔ وہ ایک بہت مصروف سڑک تھی۔ ٹریفک کا ایک اژدھام تھا جو رواں دواں تھا مسکوں کی تعداد میں موجود لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی ان بزرگ کی مشکل کو محسوس نہیں کیا۔ کسی نے انکا بوجھ نہیں بانٹا۔ انکے دلوں میں تو یہ خیال تک نہ گزرا ہوگا کہ وہ اس نحیف ونزار وجود کی مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔ یہ ان کے لئے ایک معمول کا تماشا تھا شاید...... وہ پتھروں کی بستی میں پڑے بے جان پتھر تھے۔ جن کے پتھر دل یہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ ان بزرگ کی جگہ انکے اپنے گھر کی چاردیواری میں سانس لینے والے انکے دادا بھی تو ہو سکتے تھے جواب کمزور ہو چکے ہیں۔ انکے اپنے بوڑھے نانا بھی تو ہو سکتے تھے جن کی ہمتیں اب جواب دے چکی ہیں۔ وہ بزرگ بھی تو کسی کے نانا، دادا ہوں گے جو اس وقت کیسی مشکل میں تھے۔

طاقتیں ساری زندگی انسان کے ساتھ تھوڑا رہتی ہیں۔ یہ بھی صرف جوانی کی ساتھی ہوتی ہیں۔ پل دو پل ساتھ نبھاتی ہیں اور بڑھاپے کی دھوپ بڑھتے ہی ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ وہ بزرگ بھی کبھی ہماری طرح طاقتور ہوں گے۔ صحتمند ہوں گے۔ آج وہ لاغر وکمزور تھے کل کو ہم ان کی جگہ ہوں گے۔ اور اسی طرح سڑک کنارے نوجوانوں کا ایک ٹولہ، بے حسی کی چادر اوڑھے ہمارا تماشہ دیکھنے کچھیا کھڑا ہوگا۔ انسان اسی الٹے چکر Reverse Cycle کا منتظر ہوتا ہے۔ انسان اسی الٹے چکر کا حقدار ہے۔ ماضی

خود کو دہرائے اور انسان کے منہ پر ایک طمانچہ مارتے ہوئے اسے احساس دلائے کہ تقدیر کا پھیر اسی کو کہتے ہیں۔

زندگی کے کسی نہ کسی چوراہے پہ ہمارے اعمال کھڑے ہمارے منتظر ہوتے ہیں۔ ہم نے جو عمل کئے ہوتے ہیں، کہیں نہ کہیں ہمارا ان سے ملاپ ہو جاتا ہے اور وہ پلٹ کر ہم تک واپس آ جاتے ہیں۔ ماضی حال سے ملتا ضرور ہے جلد نہ سہی بدیر سہی......لیکن انسان نادان ہے نا...مغیث ہی نہیں......

آج ہم کسی کا بوجھ بانٹیں گے تو کل کو ہمارا بوجھ بانٹنے کو بھی دو ہاتھ منتظر ہوں گے۔ ضرورت صرف ان دو ہاتھوں کی خود گچھیا بکنگ کروانے کی ہے۔ نیکیاں کرنے اور نیکیاں بانٹنے کی ہے۔ اپنے بزرگوں سے محبت کرنے کی ہے۔ بے پناہ اور بے لوث محبت...... بہت سی رحمتیں اور برکتیں ہیں جو انہی بزرگوں کے دم سے ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہیں جیسے ہی ہم انکی چھتنار چھاؤں سے محروم ہوتے ہیں وہ رحمتیں بھی ہٹ جاتی ہیں۔ لیکن پتھروں کی بستی میں پتھر بن کر جیتے ہوئے ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ احساس کی چنگاری فقط تب سلگتی ہے جب کسی دوسرے کے پاؤں سے لگی زوردار ٹھوکر سے ہم لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔ سلگنے والی چنگاری پگھلانے کی بجائے بھسم کر ڈالتی ہے۔ زوال بانہیں پھیلائے ہمارا منتظر ہوتا ہے اور عروج ہاتھ ہلاتے ہوئے ہمیں زوال کی بانہوں میں جاتا دیکھتا ہے۔ پتھروں کو آخر کار لڑھک ہی جانا ہوتا ہے، سو پتھر گہری عمیق گھاٹیوں میں لڑھک جاتے ہیں۔

☆☆☆

بیگم اسماء ممتاز

# یہ گرمیوں کے روزے!

## سحر وافطار میں اپنی غذائی عادات بہتر بنایئے تاکہ کمزوری سے بچا جا سکے

رمضان المبارک میں سحر وافطار کے اوقات میں غذا کا استعمال کچھ اس طرح نہیں رہ پاتا جو ہماری جسمانی ضروریات کے پیشِ نظر ہو اس لئے اکثر رمضان کے آخری عشرے تک کمزوری غالب ہوجاتی ہے، جو روزہ مرہ مصروفیات کی راہ میں حائل رہنے کے ساتھ ساتھ عبادت میں بھی رکاوٹ بنتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ بہتر طریقہ کار اپنا لیا جائے تو کافی حد تک جسمانی چستی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

روزے کا آغاز سحری سے ہوتا ہے اور پہلی ہی سحری میں بے وقت بیداری اور کھانے سے مطابقت پیدا نہیں ہو پاتی، انسانی معدہ غیر متوقع اوقات میں ناشتے کے برابر بھی غذا کا متحمل نہیں ہوتا۔ یوں پہلے ہی دن دوپہر کے بعد سے گرے پڑے انداز میں جوں توں کر کے دن گزرتا ہے پھر پیاس کی شدت اور افطار کے وقت بے تحاشا ٹھنڈے مشروبات یا پانی کے استعمال کی وجہ سے جسم کی غذائی ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں۔ دسترخوان پر بہت کچھ سجا ہے مگر پیاس اتنی شدید ہے کہ غٹا غٹ کئی گلاس پی جاتے ہیں۔ یوں کچھ کھانے کی نوبت ہی نہیں آتی جس کے بعد نمازِ مغرب کے لئے مرد مساجد اور خواتین جائے نماز کی طرف رواں دواں ہیں۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر آئے تو پانی کے بے جا استعمال کی بنا پر بچی رہ جانے والی افطاری آپ کی منتظر ہے۔ پکوڑے، چھولے، چاٹ وغیرہ تناول کی جاتی ہیں جس کے بعد جسم کافی بھاری اور بے جان سا ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لیٹ جائیں اور بیشتر لوگ تو کم وقت میں ایک نیند پوری بھی کر لیتے ہیں۔ اذان عشا کے وقت بمشکل اٹھنے کو تیار ہوتے ہیں اور ٹانگوں میں درد کی شکایت کرتے ہیں۔ نماز عشا سے واپسی پر کھانے کی رغبت نہیں ہوتی۔ بار بار ٹوکنے پر لگے بندھے انداز میں چند لقمے حلق سے اتارے اور پانی کے کئی گلاس پی ڈالے اور بستر پر جا سوئے۔ صبح سحری میں جاگے تو پھر وہی پیٹ بھرا بھرا محسوس ہوتا ہے۔ یوں سحری کے وقت موجود ایسی اشیا جن میں غذائیت ہوتی ہے یعنی روٹی سالن وغیرہ کے بجائے پھینی، کھجلہ یا ہلکی پھلکی اشیاء پر قناعت کر رہتے ہیں جو بعد دوپہر کمزوری کا باعث بنتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم سحری وافطاری میں جسمانی ضرورت کے مطابق غذا لینے کا اہتمام نہیں کرتے۔ مثلاً سحری میں سویاں، پھینی، کھجلہ وغیرہ مقدار میں کتنے ہی ہوں جسمانی ضرورت کے مطابق غذائیت فراہم کرنے کے قائل نہیں ہوتے۔ اس موقع پر اگر سالن روٹی کھانا ممکن نہ ہو تو گندم یا جو کا دلیہ دودھ میں پکا یا جائے جس کے ساتھ کھجوریں بھی تناول کی جائیں جو ایک دو نہیں کم از کم پانچ سے سات ہوں۔ اس طرح غذا مقدار میں کم ہی سہی مگر جسمانی ضرورت کے مطابق ہوگی جو آپ کی روزمرہ مصروفیات کی راہ میں زیادہ رکاوٹ کا باعث نہیں بنے گی۔ اسی طرح افطاری کے وقت انتہائی بے صبری کے ساتھ غٹا غٹ پانی یا

مشروبات پینے کی بجائے مزید صبر وضبط کا مظاہرہ کریں۔ ابتداً کم از کم تین کھجوریں کھائیں۔ پھر فروٹ چاٹ یا چھولے وغیرہ لیں۔ اس دوران اگر حلق بہت خشک محسوس ہو تو تھوڑا تھوڑا پانی پی لیں۔ کوشش کریں کہ نمازِ مغرب سے قبل ایک گلاس سے زیادہ پانی نہ پئیں۔ تلی ہوئی چیزوں سے اعراض کریں یہ معدے میں بھاری پن پیدا کرتی ہیں۔ نمازِ مغرب کے بعد وقفے وقفے سے ایک ایک گلاس کر کے پانی پی لیں اگر ممکن ہو تو عشا کی نماز کو جانے سے قبل کھانا کھالیں ورنہ تراویح سے فارغ ہو کر کھانے کا اہتمام کریں اور پھر کچھ چہل قدمی بھی کریں تا کہ نظام ہاضمہ درست رہے۔

افطار کے وقت پانی یا مشروبات کا بے تحاشا استعمال جسم کو تروتازہ کرنے کے بجائے کھنچاؤ اور درد کا باعث ہوتا ہے۔ خاتون خانہ اگر اپنی اور خاندان کی صحت کا شعوری ادراک کرتے ہوئے بہترین انداز میں سحری وافطاری کا انتظام کریں گی تو مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔

☆☆☆

# میٹھی عید کی میٹھی مصروفیتیں

صد شکر اللہ تعالیٰ کا جس نے ہمیں رمضان کے روزے خوش اسلوبی سے رکھنے اور اسکے انعامات سے بھرپور استفادہ کرنے موقع فراہم کیا۔ آپ سب نے یقیناً صبر، شکر، تقویٰ، ایثار، انفاق فی سبیل اللہ، باہم محبت، اخلاص، اللہ کی طرف رجوع، قرآن سے جڑنے، اسکی تلاوت کرنے اور سننے کے مواقع سے خوب خوب فائدے اٹھائے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریاں بھی جوبن پر ہوں گی۔

عید کا لفظ اپنے اندر جہانِ معنی رکھتا ہے۔ بھرپور خوشیاں اور مسرتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔ دنیا بھر کے مسلمان عید کے دن کو بھرپور تیاری اور اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے شکر ادا کرنے کا سنہری موقع ہوتا ہے کہ اس نے ہمیں رحمتوں، برکتوں اور فضیلتوں والے ماہ رمضان کا انعام عطا فرمایا۔

آیئے دیکھیں کہ ہم نے عید کے موقع پر کیا کیا تیاریاں کرنی ہیں اور کیسے اپنے رب اور رب کے بندوں کو خوش کرنا ہے۔

**عید کے کپڑوں کی خریداری:۔**

اسلام ایک معتدل دین ہے اس میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ اعتدال کی راہ یہ ہے کہ عید کے روز اپنا بہترین لباس منتخب کریں۔ بناؤ سنگھار شرعی حدود کے اندر رہ کر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن قیم فرماتے ہیں رسولؐ عیدین کے موقع پر اپنا سب سے خوبصورت لباس زیب تن فرماتے (زادالمعاد) حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسولؐ عید کے دن سرخ دھاریوں والی چادر زیب تن کرتے تھے (مجمع الزائد)

کپڑوں کی خریداری عید کی تیاریوں میں سب سے پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ خریداری ہمیشہ اپنے بجٹ کو دیکھ کر کریں کم خرچ بالا نشین کا اصول ہمیشہ مدنظر رکھیں۔ اسراف سے بچیں۔ آج کل گرمی کا موسم ہے لان کے بے شمار سوٹ مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ خاص طور پر فیشن ڈیزائنرز کے سوٹ خریدنے کا بہت رواج چل نکلا ہے مگر ایک عام خریدار پانچ سے چھ ہزار روپے کا لان کا سوٹ خریدنے کا متحمل نہیں ہوسکتا اس لئے ایک سمجھدار خاتون جو نئی طرز کا سوٹ پہننا چاہتی ہے وہ اپنے سوٹ کو خود ڈیزائن کرسکتی ہے عام لان کا سوٹ خرید کر کڑھائی والے گلے اور بارڈر بازار میں مل جاتے ہیں وہ گلے اور بارڈر قمیض پر لگائیں ایک دو رنگوں کی پلین میچنگ پٹیاں لگائیں، ساتھ جارجٹ کے دوپٹوں کو دو رنگوں میں رنگوا لیں بہت کم قیمت میں بہترین سوٹ تیار ہوجائے گا۔ یاد رکھیں آجکل جو بھی ڈیزائن آپ پہن لیں وہی فیشن بن جاتا ہے۔

بعض بازاروں میں ریڈی میڈ سوٹ سستے داموں مل جاتے ہیں جس سے وقت اور پیسے کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن ان سے سب کے برعکس جو وقار اور حسن سادگی میں ہے وہ چمکیلے اور بھڑکیلے لباسوں میں نہیں ہے۔

بچوں کے کپڑے خریدتے وقت بھی کوشش کریں کہ کم

قیمت والے کپڑے خریدیں کیونکہ بڑھتی عمر کے ساتھ ہر چھ ماہ کے بعد بچوں کے کپڑوں کا سائز تبدیل ہوجاتا ہے۔ بچے شوخ رنگ کے کپڑے پہنے اچھے لگتے ہیں مردوں گھیا سفید شلوار کے ساتھ کسی بھی رنگ میں سادہ یا دھاری دھار کرتہ عید کے موقع پر خوب جچتا ہے۔

**گھر کی صفائی ستھرائی:۔**

عید سے ایک دو روز قبل گھر کی صفائی خصوصی طور پر کروائیں یا کریں۔ دوتین روز قبل جالے اتاریں، پنکھے اور بلب صاف کریں اگر ممکن نہ ہوتو صاف ستھری بیڈ شیٹس، تو لیے اجلے پن کا احساس دلائیں گے۔عید جیسے پرمسرت دن کومنانے میں صفائی ستھرائی کی خاص اہمیت ہے۔

**تحائف کی خریداری:۔**

قریبی عزیزوں اور احباب کو تحفے تحائف دینے کو دل چاہتا ہے مگر جیب اجازت نہیں دیتی۔ اس کے لئے ضرور سوچیں کہ تحائف کیسے دیے جائیں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ تحفہ دینے سے محبت بڑھتی ہے۔تحفہ چاہے چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو وہ خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔کوئی اچھی سی کتاب، قلم، پھول، دوپٹہ، قمیض کا پیس، بیگ، والٹ، ٹاپس وغیرہ۔تحفہ لینے والے کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ وہ تحفہ میں کوئی خرابی نہ نکالے بلکہ تحفہ وصول کرتے وقت نہایت خوشی کا اظہار کرے اور دینے والے کو بتائے کہ اسے اس چیز کی بہت ضرورت تھی یا اسے یہ تحفہ پا کر بہت خوشی ہوئی۔

**غربا مساکین اور ملازمین:۔**

رمضان اور عید کے موقع پر غرباء مساکین اور ملازمین کی مدد کرنے کا بہت اجر ہے مگر اس مہنگائی کے دور میں اپنا خرچ پورا نہیں ہوتا تو غربا کو کیسے دیا جائے اپنے کپڑوں میں سے کوئی ایک دوسوٹ کسی غریب عورت یا ملازمہ کو دے سکتی ہیں۔عید کے روز پکنے والے سالن چاول یا میٹھے کی ایک پلیٹ اپنے ہمسایوں، کسی غریب یا ملازم کے گھر بھجوائیں اللہ کی راہ میں خلوص نیت سے دیا جانے والا ایک روپیہ بھی ان ہزاروں رپوؤں سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ چھپے ہوں۔

**شکرانے کے رات یا چاند رات:۔**

یکم شوال کا چاند نظر آتے ہی عید کی تیاریاں اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔مٹھائی کی دکانوں پر لوگوں کا جم غفیر دکھائی دیتا ہے لڑکیاں گھروں میں ایک دوسرے کو مہندی لگاتی ہیں۔ چوڑیوں اور جوتوں کی خریداری آخری آئٹم ہوتا ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ شکرانے کی رات میں بازاروں کا رخ کرنے کی بجائے پہلے سے مہندی اور چوڑیوں کی خریداری کر لی جائے۔ اس رات کو اپنے اور اپنے گھر والوں کچھیا دعائیں کریں کیونکہ اس رات دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا ہے۔

یہ ہمارے محاسبے کی رات ہے۔اس رات ہمیں گھریلو کام کاج کے دوران غور وفکر کرنا چاہیے کہ اس مبارک مہینے سے ہم نے کتنا فائدہ اٹھایا اور کتنا نقصان کر بیٹھے۔اگر کوئی غلطیاں کوتاہیاں ہوگئیں ہوں تو یہ معافی مانگنے کی رات ہے۔

**فطرانہ:۔**

اب سوچنے کی بات ہے ان غلطیون کا کفارہ کیسے ادا ہو اس کے لئے اللہ رب العزت نے ہمیں فطرانے جیسی نعمت سے نوازا ہے یہ صدقہ ہے ان غلطیوں کا جو ہم رمضان میں کر بیٹھے ہیں۔فطرانہ 2.50 کلوگرام گندم ہوتی ہے یا اسکے برابر قیمت ادا کردی جاتی ہے۔فطرانہ عید سے دوتین روز قبل ہی دے دینا چاہیے۔ اسے عید کی نماز سے قبل ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہم نے گھر کے ہر فرد کا

فطرانہ دے دیا ہے۔

**عید کے کھانے کی تیاری:۔**

شکرانے کی رات کو دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کے بعد عید کے دن کا مینو بنائیں مہانوں کیلئے دو سے تین ڈشز تیار کریں جیسے شیر خرما، کھیر، سینڈوچ، آلو چنے، دہی پھلکیاں، کیک، حلیم، فرائیڈ چیزوں میں رول، سموسے، کباب، نگٹس، چکن پکوڑے وغیرہ ان میں سے جو چیزیں آپ با آسانی اور جلدی بنا سکیں بنالیں۔

دوپہر یا رات کے کھانے کیلئے دو سالن اور چاول تیار کریں اگر دو تین ڈشز تیار نہیں کر سکتے تو شیر خرما، سویوں یا چاولوں کی کھیر کا ایک بڑا دیگچہ تیار کریں۔عید ملنے کیلئے آنے والوں کو شیر خرما یا کھیر پیش کریں اور ہمسایوں کے گھروں میں بھی ایک ایک پلیٹ بھجوائیں۔

**گھر والوں کے کپڑے، جوتوں کی تیاری:۔**

رات سونے سے پہلے اچھی طرح اطمینان کرلیں کہ سب افرادِ خانہ کے کپڑے استری ہو چکے ہیں اور جوتے پالش ہوکر تیار ہیں کیونکہ صبح سویرے یہ کام کرنا مشکل ہیں۔

**عید کی نماز کی تیاری:۔**

بحیثیت مسلم ہماری ثقافت، روایات غیر مسلموں سے متفرق ہیں۔غیر مسلم ناچ گا کر اپنی خوشیاں مناتے ہیں جبکہ تمام دنیا کے مسلمان دوسروں میں خوشیاں بانٹ کر عید مناتے ہیں۔

☆☆☆

ترتیب: فرزانہ چیمہ، ثمرہ، خورشید بیگم

# محشرِ خیال

## ثمرہ۔الخبر سعودی عرب

بتول کے ساتھ ہماری محبت بہت پرانی ہے۔ بچپن سے جوانی تک اسی کی انگلی تھامے زندگی کا سفر کرتے آئے ہیں لیکن اس کی محفل میں یوں تحریری طور پر شرکت کی ہمت آج کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی تحریر کو کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں کہ بتول کی خدمت میں ارسال کریں۔ آج حوصلہ کر کے اپنا کچھ تبصرہ کچھ تحریر اور کچھ پیار لفظوں میں سمو کر بھیج رہی ہوں۔ اگر تحریر شائع کرنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ کوئی بات نہیں۔

آج کے اس دور میں خواتین کی جو تعلیم و تربیت بتول کر رہا ہے اس کے لیے بتول کی ساری ٹیم ہی مبارکباد کی حق دار ہے۔ تمام سلسلے ہی اچھے ہیں البتہ کچھ باتیں محسوس ہو رہی ہیں۔

اکثر افسانوں میں خواتین کے مسائل، شوہروں کی طرف سے ہونے والی حق تلفیاں، مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات اور ساس بہو کے درمیان پیدا ہونے والی تلخیاں کہانی کے انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ میں یہ مانتی ہوں کہ یہ سب باتیں ہمارے معاشرے کی حقیقتیں ہیں بلکہ افسانوں سے باہر حقیقت کی دنیا اور بھی زیادہ گھناؤنی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

چند سال پہلے ''ابن آدم نمبر'' میں نوّے فیصد کہانیاں ایسی تھیں، ہر کہانی پڑھ کر دل یہی کہتا تھا کہ ہاں ہے تو یہ سچی بات۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خواتین ہی کی یہ باتیں خواتین کے رسالے میں دیئے چلے جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ کچھ کہانیوں میں تو جہاں عورتیں ہی فساد کی جڑ ہیں ان کے محاسبے اور اصلاح کچھیا تو نکات مل جاتے ہیں لیکن جہاں عورتیں شوہروں کے ہاتھوں ستائی جاتی ہیں، ان کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر بتول کی قاری بہنیں جو خود بھی کسی نہ کسی شکل میں ان ہی مسائل سے دوچار ہیں ان کی محرومی یا احساس مظلومیت اور بڑھ جاتا ہے۔ ہم خواتین اکثر اس سسٹم میں رہتے ہوئے اتنی مجبور ہو جاتی ہیں کہ کچھ بھی نہیں کر سکتیں اور مرد جن کے پاس سارا اختیار ہوتا ہے اور جن کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ تحریریں پڑھتے ہی کب ہیں!

اب یا تو کوئی رسالہ اپنے ان بھائیوں کے نام بھی نکالیں یا کم از کم یہ ''ابن آدم نمبر'' ان میں تحفتاً تقسیم کروانے کا اہتمام کر دیں۔

میں مانتی ہوں کہ جب تک یہ حالات رہیں گے یہی سبق اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے لئے اچھا ہے کہ صبر اور شکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور جو کام بھی کریں وہ خالصتاً اللہ کے لئے کریں لیکن میرا خیال ہے کہ ان نکات کے علاوہ ایک اور نکتہ کا بھی اضافہ کر لینا مفید رہے گا اور وہ ہے'' حکمت''۔

بچیوں کی تربیت میں جہاں ہم انہیں ایثار اور خدمت کے ساتھ دلوں کو جیتنے کا گُر سکھاتے ہیں وہاں انہیں حالات

کی نزاکت اور حکمت کے ساتھ حالات سے نمٹنا بھی سکھانا چاہیے، اور میرا خیال ہے یہی اسلامی مزاج ہے۔ پتھروں کے ساتھ سر پھوڑنے کی بجائے پانی کی طرح ان کے بیچوں بیچ راستہ بنانے کا فن بھی آنا چاہیے۔ درست کہ یہ فن تو شادی کے بعد آدھی عمر گزرنے تک ہی ہاتھ آتا ہے۔ مگر جہاں فزکس، کیمسٹری اور اب کمپیوٹر کی گتھیاں سلجھانے میں ہماری نازک بیٹیاں اتنی مغز ماری کر رہی ہیں انہیں یہ علوم سکھانے کا کام بھی ہونا چاہیے اور کچھ نہیں تو انہی اصلاحی رسائل کے ذریعے......کہانی اور افسانوں کے ذریعے۔

اس سب کے ساتھ ایک اور راستہ جو واقعی حالات بدل کر ان شاءاللہ ہمیں نئی دنیا میں لے جاسکتا ہے اور وہ ہے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی تربیت۔

آج بحیثیت بہو، جو آپ کو نہیں ملا وہ سب آپ اپنی بہو کو دلوائیں۔ یہ ایک اچھا خاصا الگ موضوع ہے، جس پر کام ہوسکتا ہے۔ میری لکھنے والی بہنیں اس خاکے میں رنگ بھر سکتی ہیں، اور ان شاء اللہ اگر بتول کے ذریعہ اس کام کی ابتدا ہو تو یہ اچھا سنگ میل ثابت ہوگا۔

☆☆☆

## فرزانہ چیمہ۔ لاہور

سب سے پہلے تو تمام قارئین سے گزارش ہے کہ ہماری عزیز بہن ڈاکٹر نزہت اکرام کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ ایک بہت خوبصورت شخصیت اپنے حصے کا کام تن دہی سے انجام دے کر مالک حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ تادیر ان کی یاد آتی رہے گی۔ ان کی کمی محسوس ہوتی رہے گی۔ اللہ رب العالمین ان کی تمام آزمائشوں، تنہائیوں، کٹھنائیوں اور دوسروں کی کج ادائیوں کے بدلے ان کو بے شمار اجر وثواب سے نوازے اور جنت الفردوس میں ان کا بہترین ٹھکانا فرمائے۔ آمین

محشر خیال میں ادارتی ٹیم میں اضافے کے بعد حاضری دینا چاہتی تھی مگر روزمرہ کی نس نس فرصت ہی کہاں دیتی ہے۔ بس اسی بھاگ دوڑ میں ہی پیمانۂ حیات لبریز ہوجاتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو سورۃ العصر کو اپنی زندگی کا محور بنالیں پر کتھوں؟ کبھی حق کی پاسداری، حق کی پہچان، حق کی نصیحت کرنے کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ اور کبھی صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے اور بات بات پر بے صبری کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی ادارتی ٹیم کی۔ آسیہ راشد کی شمولیت پر انہیں ہوا کے دوش پر مبارک تو دے دی تھی یعنی ٹیلی فون پر۔ البتہ تحریری مبارک دیتے دیتے یہ دن آ گئے ان کی شمولیت کی ایسی راحت، رحمت یا برکت ہوئی ہے کہ ان کی تحریر چھوڑ ان کے اہل خانہ کے نام بھی جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ یہ وہی آسیہ ہیں جو جنوری کے بتول' میں اشاریہ اس شوق سے شروع تا آخر پڑھا کرتی تھیں کہ شاید کہیں اپنا نام بھی دکھائی دے جائے مگر کچھ لکھیں تو نام بھی آتا۔ اسی شوق کا انہوں نے جب مجھ سے قہقہہ لگاتے ہوئے ذکر کیا تو میرا جواب تھا ''آسیہ! اس کے لئے آپ کو کچھ لکھنا ہوگا۔ بغیر لکھے اشاریے کی چاردیواری میں داخل نہیں ہوا جاتا۔'' جواب میں ایک عزم کا اظہار ہوتا مگر اگلا اشاریہ پھر آسیہ کے نام کے بغیر ہوتا۔ الحمدللہ! 2012ء کا اشاریہ آسیہ راشد کے نام کو بار بار سمیٹے ہوئے ہوگا، ان شاء العزیز اس سے معلوم ہوا کہ سوئے ہوئے، جامد جامد، سست سست قلمکاروں کو متحرک کرنے کا تیر بہدف نسخہ یہی ہے کہ انہیں ادارتی ٹیم میں شامل کرلیا جائے۔

''بتول'' ہر لحاظ سے ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس

میں لکھنے والے محض اللہ کی رضا کچھیا لکھیں تو ہم خرما وہم ثواب والی بات ہو جائے گی۔ محشر خیال کے توسط سے اگر ہم لمحہ بھر کے لئے بیرون ملک اپنی عزیزان کو سلام دعا کہتے ہوئے انہیں لکھنے کی تاکید کرتے چلیں تو کیا مضائقہ ہے۔ بھئی فرحانہ احمد، ام صفی اور وہ تمام دوسری بہنیں جو بتول تو شوق سے پڑھتی ہیں مگر قلم اٹھائے عرصہ ہی گزر گیا ہے ان سب سے درخواست ہے کہ قلمی جہاد میں شامل ہو جایئے۔ ابھی اور آج ہی، کون جانے۔ ؎

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

تمام قارئین کے لئے سلام، دعائیں اور نیک تمنائیں

☆☆☆

## خورشید بیگم۔گوجرہ

ماہ جون 2012ء کے بتول میں شیما ہمایوں کی آپ بیتی ''کراچی سے ڈھاکہ'' پڑھنے کو ملی۔ مبارکباد کی مستحق ہیں میری بہن کہ ہر طریقہ اور ہر انداز سے مختلف خاندان میں کامیاب ازادواجی زندگی گزاری۔ اس تحریر سے میری بہن کامیاب مصنفہ ثابت ہوتی ہیں۔ خرم مراد صاحب کی تحریریں تو ویسے ہی مثالی ہوتی ہیں۔ انکی بہن لکھنے کے قابل کیوں نہ ہوں۔ تحریر میں اردو زبان کی غلطیاں بھی خاص نہیں کیونکہ انہوں نے تعلیم تو پاکستان میں اردو زبان میں ہی حاصل کی تھی۔ تحریر اس لحاظ سے مثالی ہے کہ آجکل کی نوجوان لڑکیوں کے لئے کامیاب ازدواجی زندگی کے دو نادر نسخے لئے ہوئے ہے۔ وہ نسخے میں دوبارہ نقل کئے دیتی ہوں کہ اگر بہو، بیٹیوں کو پانچ صفحات کی آپ بیتی پڑھنے کی فرصت نہ ملے ہو تو چند جملے پڑھ کر نصیحت قبول کر لیں۔

### میکے میں تربیت

(۱) اماں کے تعلق کا انداز ذرا مختلف ہی تھا۔ محبت بھی، خیال بھی اور تربیت بھی۔

(۲) جس ماحول میں پرورش پائی اس میں یہ سیکھا کہ اپنی بات منوائی جائے یا زور آوری کی جائے۔ چپ رہ کر ہر بات مان جانے کی تربیت ہی کام آئی۔

### سسرال میں رویہ

ناپسندیدہ بات پر خاموشی اختیار کی، جوابی کارروائی کا تو کبھی سوچا نہیں۔ خاموشی ہی سب سے بہتر ہے، عافیت چپ رہنے میں ہے، بولنے سے بات بڑھتی ہے۔ اپنی خامیاں تو کسی کو نظر نہیں آتیں اس لئے اپنا دفاع بے کار رہے، پھر صبر کا بڑا اجر ہے۔ اچھی اچھی کتب زیر مطالعہ رہیں تو دماغ اچھا کام کرتا ہے۔

مدیرہ محترمہ سے میری یہ درخواست ہے کہ بہن شیما ہمایوں سے کہیں وہ اپنی مکمل خودنوشت لکھیں۔

☆☆☆

## پالنا

(مہہ وش عاطف ۔ کراچی)

آج پھر میں وہاں سے گزری ۔ وہ وہیں اپنی جگہ پر تھا۔ پتہ نہیں سب کے ذہنوں میں یہ اسی طرح چپک جاتا تھا یا میرے ہی ذہن میں اسطرح گھومتا ہے۔ وہ ایک ''پالنا'' تھا جو کسی ویلفیئر تنظیم کی جانب سے لگا ہوا تھا۔ یہ میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا اور میں جب اس کو دیکھتی ایک خوف ساطاری ہو جاتا۔ بہت سے سوال اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے ۔ ایسی کون سے مجبوری ہوتی ہے جو ایک ماں اپنا بچہ پالنے کی نذر کر دیتی ہے۔ کیا ماں کی گود چھوٹی پڑتی ہے۔ کوئی مجبوری ظاہر کر کے ماں خود کو کیسے بری کر سکتی ہے۔ یا پھر یہ پالنا بھی اور برائیوں کی طرح ہماری زندگیوں کا حصّہ بن گیا ہے یا ہمیہمارے دلوں سے گناہ کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ کیا اولاد اتنی غیر ضروری تھی؟ یا بوجھ تھی؟ کیا دنیا کا بہترین سے بہترین welfare centre کا یہ پالنا ماں کی گود کا نعم البدل ہوسکتا ہے؟

مائیں تو کسی بھی قوم کی معمار ہوتی ہیں، اسکے مستقبل کی معمار۔ تو آج ہماری ماؤں نے اپنی گود کو، اپنی عفت کو، اپنی عظمت کو، اپنی اولاد کو اتنا بے توقیر کیوں کر دیا۔ یا افلاس نے ہمارے دلوں کی نرمی ختم کر ڈالی ہے؟ کون جواب دے گا!

☆☆☆

## کیا پھر بھی ہم اللہ کا شکر ادا نہ کریں

(شفقت ہما۔ شارجہ)

آج باجی سے online بات ہوئی تو موضوع گفتگو بچوں کے مولوی صاحب اور ان کی بیوی تھے، باجی کہنے لگی'' آج دوسال کے بعد میری بچوں کے مولوی صاحب کی بیوی سے ملاقات ہوئی ہے، میں نے بچوں کا حال احوال پوچھا تو وہ بتانے لگیں کہ سب سے بڑے بیٹے نے عالم کا کورس ملتان سے مکمل کیا ہے اور رمضان میں اسکی دستار بندی کراچی میں ہونی تھی وہ اسی سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا ان دنوں کراچی کے حالات کچھ اچھے نہیں تھے تو راستے میں کسی دہشت گرد کی گولی کر نشانہ بن کر شہید ہو گئے اور پھر دوسرے دن سب بچے جو دستار بندی کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے مولوی صاحب کا جسد خاکی لے کر تدفین کے لئے جا رہے تھے تو راستے میں دہشت گردوں نے روک کر ان سے روپیہ پیسہ سب کچھ چھین لیا اور پھر کہا اپنے ہاتھ پیچھے کر لو اور سر نیچے کر لو۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ ہمیں بھی ابھی مار ڈالیں گے لیکن وہ دہشت گرد بھاگ گئے اور یہ لوگ تدفین سے فارغ ہو کر واپس اپنی رہائش کی طرف آئے تو حالات ان دنوں کچھ اس قدر خراب تھے کہ باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا تو دس روزے ان سب لوگوں نے صرف پانی سے رکھے اور افطار میں بھی صرف پانی پیتے تھے جب عید پر ہر بچہ اپنے والدین

کے پاس گیا تو ماں نے بچے کو دیکھتے ہی کہا: میرے بچے آپ اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہیں تو بچے نے بتایا اماں دس روزے ہم نے صرف پانی سے رکھے اور افطار کیے ہیں۔'' جب میں نے ان کی یہ بات سنی تو اپنے دل میں سوچا کہ کیا ہم نے اپنے روزے افطار کرتے ہوئے کبھی یہ سوچا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ایک ساتھ کھاتے ہیں اور کیا ہم ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور ہمارے کتنے بہن بھائی ہیں جن کو یہ نعمتیں میسر نہیں ہیں اور ہمیں ان لوگوں کو بھی اپنے مال سے افطار کے لئے کچھ دینا چاہیے یہ ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے۔

☆☆☆

## آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

(سارہ نور۔لاہور)

جب سے آنکھ کھولی، میں نے اس کو اپنے سامنے پایا۔ شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ بہت سوال کئے ہر اس شخص سے جو اس کے ماضی سے باخبر تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر شخص ہی اس کے بہت محبت کرتا ہے۔توانا ہونے کے باوجود میں نے ہمیشہ اس کے چہرے پر دکھ کی گہری سیاہی دیکھی۔شاید یہ کوئی ایسا دکھ تھا جسکو اس نے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید اور آرزوؤں کے دیئے جھلمار ہے ہوتے اور......کبھی کبھی وہ یاسیت کی تیز آندھیوں میں ٹمٹمانے لگتے تھے جیسے ابھی بجھ جائیں گے۔

اس کے کرب کا اندازہ لگانے کے لئے، اس کے اندر اٹھتے درد کو جاننے کے لئے میں نے اس کے قریب جا کر بھی دیکھا۔مگر اس کی آنکھوں میں نجانے کیا تھا......خوف یا بے بسی۔میں اس سے سوال بھی نہ کر پاتی۔ حیرت تو مجھے اس بات پر ہوئی کہ اللہ نے اسے ہر طرح کی نعمت سے نواز رکھا ہے۔اس کے بیٹے بھی ہیں۔مگر پھر بھی......

جب غم کی شدت اسے تڑپاتی تو وہ بے اختیار اپنے بیٹوں کو آوازیں دینے لگتا۔شاید اسکے بیٹے اسے چھوڑ کر کہیں جا چکے تھے......! مجھے اس کا غم اپنا غم لگتا، اس کے آنسوؤں کے ساتھ میرے آنسو بھی شامل ہو جایا کرتے۔ایک انجانے غم نے مجھے اس کے بہت قریب کر دیا۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے بے پناہ محبت محسوس کی مجھے احساس ہونے لگا کہ اس کا وجود میرے لئے کتنا اہم ہے......کتنا ضروری ہے......! میں تو اس کے غم سے بھی آشنا ہو چکی تھی۔ یہ غم مجھے بھی اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا...... میں نے اس کے غم کو ہر جگہ ہی تو تلاشا تھا......غم کی وہ تپش جس کا اندازہ میں اس کے چہرے سے نہ کر سکی، اس کے وجود پر جگہ جگہ اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔اب تو اسکے چہرے پر دکھ کی سیاہی مزید گہری ہو گئی تھی۔اس کا توانا جسم کمزور پڑ گیا تھا۔اور اکثر وہ خاموش ہی رہا کرتا تھا۔ امید کے دیوں سے روشن اسکی آنکھیں بے نور سی ہو گئی تھیں۔ میں نے بغور اس شکستہ حال وجود کو دیکھا۔ خاموش نگاہوں میں امید کی روشنی ابھری تھی......میں چپ چاپ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی......یہ لرزتا وجود، جس کے دائیں بائیں خوف اور دہشت کے سائے منڈلا رہے ہوتے، مجھ سے مخاطب تھا......

''میری کمر میرے بیٹوں کی نااہلیت کے بوجھ سے جھک گئی ہے۔میرے نوجوان بیٹوں نے میری عزت وآبرو اور میری سلامتی داؤ پر لگا دی ہے۔ وہ مجھ سے غافل ہو گئے ہیں لیکن میں انہیں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔شاید وہ بھول گئے ہیں کہ اگر میں نہ رہا تو وہ ذلت کی زندگی اور ذلت کی موت کا سامنا کریں گے۔ دیکھو تو سہی! میرے اپنوں نے میری

پاسبانی کا فریضہ سوداگروں کو سونپ دیا ہے۔ سچ پوچھو تو میرا غم میری روح پر تازیانے برسا رہا ہے۔

سنو! مجھے سہارا دو! میرے وجود کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو میرے غم کی تپش میں میری طرح جھلستے ہیں، میرے لئے سوچتے ہیں اور میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں...... میری روح کو تقویت دو! تمہاری زندگی کی بقا صرف اسی میں ہے۔ سنو! میری روح اسلام ہے، میرا نام پاکستان ہے۔''

میری آنکھوں کا پانی پاکستان کی زرخیز اور شاداب مٹی میں جذب ہورہا تھا۔ ''میرے اللہ اسے اپنی عافیت میں رکھنا!'' میں نے سر اٹھا کر کمزور پاکستان کو دیکھا۔ اس کی شکستہ حالت میرے لئے ناقابل برداشت تھی...... ایسی شکستہ حالت کہ اس کا بازو تو کٹا ہوا تھا اور اب ایک جل رہا تھا۔ اس کے وجود پر جگہ جگہ فرعونیت اپنے پنجے گاڑ رہی تھی۔ صیہونیت کی سیاہ رات اس پر چھانے کو تھی۔

میں نے عزم کرلیا...... عہد کرلیا...... خود سے بھی اور پاکستان سے بھی...... اسکی روح کو تقویت دینے کا عہد...... اپنی بقا کیلئے، نسل نو کی حفاظت کے لئے...... کہ پاکستان کا وجود ہمارے لئے بہت ضروری ہے،

لیکن گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ کسی ان دیکھے وقت کی ان کہی عبرتناک داستان کہہ رہا ہے، اور ...... آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

☆☆☆

## اوروں کو بھی دکھلا دے

(روبینہ عاطف۔ لاہور)

میں بہت دکھی تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ دعا مانگتے باباجان نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کیا ہوا؟ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا باباجان پاکستان میچ ہار گیا۔ ''اچھا'' باباجان نے بڑے سکون سے کہا ''تو پھر؟''

''تو پھر کیا باباجان میں تڑپ اٹھی۔ آپ تو کہتے ہیں انسان خلوص سے اللہ سے مدد مانگے تو وہ ضرور مدد کرتا ہے بلکہ اسکی مدد کو فرشتے اترتے ہیں۔ ہم نے تو بہت خلوص سے دعائیں مانگی تھیں پھر بھی مسلمان ہار گئے کافروں سے۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''مسلمان، کون سے مسلمان'' باباجان نے بھی تڑپ کر پوچھا ''وہ جن کے سٹیڈیم آباد اور مسجدیں ویران تھیں وہ جو ظہر سے لیکر عشاء کی اذان کی آواز پر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے معرکہ اُحد یاد ہے'' بابا بولے ''اللہ کے نبیؐ کے ایک حکم کی نافرمانی پر معرکہ حق و باطل میں نبیؐ کی موجودگی میں مسلمان اللہ کی تائید و نصرت سے محروم ہوگئے تھے۔ یہاں تو اتنی نافرمانیاں ہیں۔ رہی فرشتے اترنے کی بات تو یقیناً وہ اترتے ہیں لیکن اس کے لئے وہ فضا تو پیدا کرو، بقول شاعر

ے فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو<br>
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

''لیکن باباجان میں نے تو ساری نمازیں پڑھی تھیں۔ اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہونگے، ہمارا تو سب مذاق اڑائیں گے ناکہ اللہ نے تمہاری بڑی سن لی۔''

''لوگوں کی باتوں پر دھیان مت دو۔'' انہوں نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے اللہ سے رابطہ مضبوط رکھو۔ یاد رکھو۔ اگر وہ تمہاری دعائیں قبول کررہا ہے تو تمہارا ''یقین'' بڑھا رہا ہے۔ اگر دعائیں پوری کرنے میں دیر کررہا ہے تو تمہارا ''صبر'' بڑھا رہا ہے۔ اگر دعاؤں کا جواب نہیں دے رہا تو تمہیں آزما رہا ہے۔ ایک قصہ سناؤں۔''

''جی''میں نے کہا

''کہتے ہیں ایک دن شیطان نے ایک ولی سے کہا تمہیں اپنے رب پر بہت بھروسہ ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ ولی نے کہا''بالکل''شیطان نے کہا پھر جاؤ اور بلندی سے چھلانگ لگا دو اور دیکھو وہ تمہیں بچاتا ہے یا نہیں۔ جانتی ہو ولی نے کیا کہا؟''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ولیبو لا دفع ہو جا مردود یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ بندے کو آزمائے۔ بندے کی مجال نہیں کہ وہ رب کو آزمائے۔بس اپنی تقدیر کا ہر فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں دے دو اس سے دعا تو کرو پر ضد نہ کرو۔''

''لیکن بابا جان مسلمانوں کی دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں۔''میں پورا اطمینان کرنا چاہ رہی تھی

''سب کی روحیں بیمار اور کمزور ہیں۔''

''کوئی علاج تو ہوگا؟''میں نے کہا

''کبھی بیمار ہوئی ہو؟''انہوں نے پوچھا۔

''جی''میں نے کہا

''شفا کیسے پائی؟''

''ڈاکٹر کی دوا لی اور اسکی ہدایت پر عمل کیا''میں نے کہا

''بس یہی کرنا ہے۔''

''جی! کیا مطلب؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''روح اگر بیمار ہو تو اسکے علاج کے لئے اللہ کی دوا اور ہدایات یعنی قرآن مجید اور نبی کریمؐ کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ روح طاقت ور اور صحت یاب ہوگی تو اسکے عمل یعنی دعا میں طاقت آجائے گی۔''

بابا جان نے بات ختم کرنے کا اشارہ کر کے آنکھیں بند کرلیں۔لیکن ان کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ دعا ہے کہ انکی باتیں اوروں کی آنکھیں کھولنے کا سبب بنیں (آمین)

☆☆☆

## قرآن کی برکت

(شہزادی پھول بانو)

پچھلے دنوں ایک ایسی بوڑھی خاتون کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا جو فالج کی مریضہ بن کر بستر ہی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی ساری زندگی کیسے اللہ کی فرمانبرداری میں گزری ہوگی۔

ان کی زبان پر قرآن پاک کی تلاوت اور نبی کریمؐ کی دعاؤں کے علاوہ کوئی اور بات ہی نہیں تھی میرے ساتھ میرا بیٹا بھی تھا۔اس نے سورۃ رحمٰن یاد کی ہوئی ہے میں نے اس سے کہا کہ آپ ان اماں جی کو سورۃ رحمٰن سناؤ۔

تو وہ اس وقت حیران رہ گیا جب اس کی دو غلطیوں کی اصلاح خاتون نے کی۔ وہ خاتون میرے بیٹےسے کہنے لگیں کہ آپ چلتے پھرتے اس سورۃ کی تلاوت کیا کرو تو تمہاری سورۃ پکی ہو جائے گی۔

پھر وہ بتانے لگیں کہ میں قرآن پاک کی اتنی تلاوت کیا کرتی تھی کہ میری زبان ہی نہ رکتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات مجھے اپنے ہاتھ سے زبان پکڑنی پڑتی تھی اور میں نے آج تک کسی کے ساتھ بُرا نہیں کیا گالی نہیں دی کوئی فضول بات نہیں کی۔میں سوچنے لگی یہ اسی کی برکت ہے کہ آج بھی آپ کی زبان پر کوئی فضول بات نہیں بلکہ قرآن کی تلاوت جاری ہے اور اللہ نے آپ کی خدمت کے لئے کیسی نیک بہو عطا فرمائی ہے اور ایک بہت ہی پیاری بات انہوں نے کی کہ میں اللہ سے ہر وقت دعا کرتی ہوں کہ اللہ تو نے مجھے اس آزمائش میں

ڈالا اس میں کیا حکمت ہے تو ہی جانتا ہے۔ لیکن تو کسی دشمن کو بھی کسی کا محتاج نہ کرنا۔

میں ان کو اپنا نام بتا کر اپنے لئے دعا کا کہہ کر وہاں سے ان کی صحت کی دعا کرتی ہوئی چل دی اور راستے میں یہ نیت کرتی ہوئی آئی کہ ان شاء اللہ میں بھی قرآن کو اسی طرح یاد کرنے اور دہرانے کی کوشش کرتی رہوں گی۔

☆☆☆